پسِ آئینہ

ناصر حسنی

بسم الله الرحمن الرحيم

جملہ حقوق

بحق مصنف محفوظ ہیں

نام کتاب: پس آئینہ

مصنف: ناصر حسنی

سن اشاعت: اگست ۲۰۲۲

تعداد کتاب: 500

قیمت: -/800

کمپوزنگ: محمد حسنین

سرورق: ظفر اقبال

پرنٹر: یونیورسٹی پرنٹنگ پریس

پتہ: حسنی کتاب گھر مہاجر کالونی بغداد لجدید گلی نمبر 08 بھاولپور

رابطہ نمبر: 0313-6558283

انتساب

مکرم محترم جناب

انجینئر پروفیسر ڈاکٹر **اطہر محبوب** تمغہ امتیاز وائس چانسلر

اسلامیہ یونیورسٹی بھاولپور

محترم جناب **شہزاد احمد خالد** صاحب

ڈائریکٹر تعلقات عامہ واطلاعات اسلامیہ یونیورسٹی بھاولپور

کی ادب پروری وادیب نوازی کے نام

فہرست

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۱	شروعات	۶
۲	خاکے کا قطبی تارا	۷
۳	خاکہ نگاری کی ایک نئی جہت	۱۶
۴	ناصر حسنی کی خاکہ نگاری	۲۳
۵	اقلیم سخن کا ابدالی	۲۸
۶	اُردو اَدب کا ماؤزے تنگ	۳۰
۷	مردِ آہن	۳۴
۸	ملحد	۳۸
۹	نئی غزل کا پیمبر	۴۱
۱۰	جمالِ اَدب	۴۴
۱۱	منزل مراد کا راہی	۴۵
۱۲	دشت صحافت کا مسافر	۵۰
۱۳	آتش ابھی جوان ہے	۵۵
۱۴	صائب الرائے	۵۹
۱۵	عابد شب بے دار	۶۲
۱۶	سراپا جمال	۶۵
۱۷	چھوٹی بحر بڑی غزل	۶۹
۱۸	سخن پرور	۷۲
۱۹	گفتہ ناگفتہ	۷۶

۲۰	میٹھاسُر	۷۹
۲۱	دِل دِل پاکستان	۸۱
۲۲	مقتول قاتل	۸۴
۲۳	منڈاپیر	۹۰
۲۴	سدابہار	۹۳
۲۵	مردِرشید	۹۶
۲۶	شیریں کلام	۹۸
۲۷	خودساز	۱۰۲
۲۸	شادباد	۱۰۵
۲۹	ہونہار	۱۰۸
۳۰	روہی کامجذوب	۱۱۲
۳۱	نظریاتی	۱۱۶
۳۲	مہمان نواز	۱۱۹
۳۳	امیتابھ کاچھوٹو	۱۲۲
۳۴	ہم زاد	۱۲۵
۳۵	ادب دوست	۱۲۹
۳۶	ہلالِ بھاولپور	۱۳۳
۳۷	سیاست کاولی	۱۳۶
۳۸	سبزرُتوں کاپیامبر	۱۴۰

شروعات

پس آئینہ میں شامل خاکے روزنامہ پاکستان ملتان روز نامہ مغرب پاکستان لاہور پندرہ روزہ حقیقت بہاولپور اور ہفت روزہ طرب بہاولپور میں شامل ہوتے رہے ہیں چند خاکے ایسے ہیں جو قند مکرر نہیں خاکہ نگاری ایک مشکل صنف ادب ہے احترام کے باوجود خاکہ نگار بے ادبی کا مرتکب قرار پاتا ہے کہا جاتا ہے کہ خاکہ نگاری اور سکیچ ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں مگر اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ خاکہ محبوب شخصیات کا لکھا جاتا ہے اور سکیچ مطلوب لوگوں کا بنایا جاتا ہے پس آئینہ میں کون محبوب ہے کون مطلوب ہے اس کا فیصلہ قارئین ہی کر سکتے ہیں عزیزم حافظ سید طلال سے اظہار ممنونیت ضروری ہے کہ بکھرے ہوئے خاکوں اور تصاویر کو یکجا کیا ورنہ ہم اس بھاری پتھر کو چوم کر ہی رکھ دیتے۔

سعید احمد المعروف ناصر حسنی

خاکے کا قطبی تارا

تحریر: سید طالب حسین شاہ

ناصر حسنی سے پہلی ملاقات پروفیسر قدرت اللہ شہزاد کے توسط سے ہوئی۔ ہم ان کی گلی میں پہنچ کر بھی ان تک نہ پہنچ سکے کیونکہ گلی محلے والے ناصر حسنی نام کے کسی فرد سے واقف ہی نہیں تھے۔ وہ تو اتفاقاً ایک دکان کے باہر روزنامہ جسارت میں اشتہارات کی بکنگ کا بورڈ لگا دیکھ کر ہم نے دکان پر بیٹھے نوجوان سے پوچھا کہ یہ اشتہار کون بُک کرتا ہے اور جسارت کا نمائندہ کون ہے تو تب پتہ چلا کہ یہی ناصر حسنی کا ٹھکانہ ہے۔ وہ نوجوان گھر سے انھیں بلا لایا۔ بڑی بے تکلفی اور خوش اخلاقی سے گلے ملے اور ہنستے ہوئے کہا کہ محلے والے سعید احمد کو جانتے ہیں ناصر حسنی کو نہیں اور ساتھ ہی چائے کا آرڈر دے دیا اور اسی دکان پر بیٹھ کر ہم ان سے دیر تک باتیں کرتے رہے۔ چائے کڑک دار اور ان کے خلوص کی طرح میٹھی تھی۔ اس کی بے تکلفانہ اور پر خلوص گفتگو سے ہی اندازہ ہوگیا کہ یہ قلم کا محنت کش ہے اسی لئے ہر بات کھری اور لگی لپٹی کے بغیر کہہ دیتا ہے۔ قلم کے مزدور کو کسی کا ڈر خوف نہیں ہوا کرتا۔

باتوں باتوں میں یہ راز بھی کھلا کہ ان کے والد صاحب قیامِ پاکستان سے قبل ریاست سچین (گجرات) میں چیف جسٹس (قاضی القضاہ) کے عہدہ پر فائز رہ چکے ہیں۔ ریاست رام پور کے مدرسہ عالیہ میں استاد بھی رہے ہیں۔ سعید احمد سے ناصر حسنی بننے تک اس قلم کار نے خون پسینہ ایک کیا ہے۔

ایس ڈی ہائی سکول کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے ناصر حسنی کو لفظوں کی پہچان کروائی اور ہاتھ میں قلم تھمایا۔ سعید احمد علم وادب، صحافت، شاعری، افسانچہ نگار اور خاکہ نگاری کے میدان کارزار میں اپنے قلم کو علم بنا کر بلندیوں کو چھوتا چلا گیا۔ آج اسے جہاں افسانچہ نگاری کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے وہیں وہ خاکہ نگاری کا بھی ایک اہم نام بن چکا ہے۔ کالم نگاری اس کا ذریعہ روزگار بھی ہے اور اس کی صحافتی ذمہ داری بھی مگر خاکہ نگاری کا وہ ڈائریکٹ حوالدار رہے۔

اردو ادب میں خاکہ نگاری ذرا دیر میں متعارف ہوئی۔ سجاد حیدر یلدرم نے سرسید احمد خاں کا خاکہ ’’خافی خاں‘‘ کے عنوان سے لکھا تو فرحت اللہ بیگ نے مولوی نذیر احمد کی کہانی کچھ اپنی کچھ ان کی زبانی لکھ کر خاکے کو بام عروج تک پہنچا دیا۔ پھر ’’دہلی کا یادگار مشاعرہ‘‘ برپا کر کے فرحت اللہ بیگ نے خاکے کو ایک الگ صنف ادب ہونے کی سند عطا کی مگر اردو ادب تخلیق کرنے والوں نے اس صنف ادب کو درخور اعتنا نہ سمجھا مولوی عبدالحق بابائے اردو کے نام ’’دیو مالی‘‘ نے جھیل کے ٹھہرے ہوئے پانی میں ارتعاش پیدا کر دیا اور پھر دائرے بننا شروع ہو گئے۔

انہیں دائروں میں شاہد احمد دہلوی، اشرف صبوحی، رشید احمد صدیقی، سعادت حسن منٹو، محمد طفیل، ممتاز مفتی، احمد ندیم قاسمی، عطاء الحق قاسمی، عبدالمجید سالک، مالک رام، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر وزیر آغا، مرزا ادیب، اے حمید، ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، ڈاکٹر اسلم فرخی اور بہت سے نامور ادیب اپنے قلم کو چپو بنائے خاکہ نگاری کی کشتی چلاتے نظر آتے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد رئیس احمد جعفری نے ’’دیدوشنید‘‘ کے ذریعے خاکہ نگاری کو پاکستان میں متعارف کروایا پھر سعادت حسن منٹو ’’لاؤڈ سپیکر‘‘ لئے ’’گنجے فرشتے‘‘ کا لاؤ لشکر لے آئے۔ اسی دور میں شاہد احمد دہلوی نے ’’گنجینۂ گوہر‘‘ پیش کر دیا۔ مگر ان سب پر بھاری پڑے جناب محمد طفیل، جنھوں نے ایسے نقوش ثبت کئے کہ رہتی دنیا تک یاد رکھے جائیں گے۔ محمد طفیل نے صاحب، جناب، آپ، محترم، مکرم، معظم، مجی اور مخدومی کے ذریعے خاکہ نگاری کو اردو نثر کے ماتھے کا جھومر بنا دیا۔

جنوبی پنجاب میں سید مسعود حسن شہاب دہلوی اپنی ہمہ جہت ادبی وصحافتی سرگرمیوں کی وجہ سے ایک مستند نام ہے۔ انھوں نے خاکہ نگاری جیسے مشکل فن کے ذریعے مشاہیر بہاولپور کی تصویر کشی کر کے اپنے خاکہ نگار ہونے کا لوہا منوایا۔

بہاولپور ایک ادب خیز خطہ ارض ہے یہاں ہر دور میں نامور ادیب اور شعراء پھلتے پھولتے رہے ہیں۔ انیس شاہ جیلانی کیلئے ’’آدمی غنیمت ہے‘‘ جب کہ پروفیسر عطاء اللہ اعوان ’’

ندیمان جمال'' کی محفل میں خوش وخرم نظر آتے ہیں پروفیسر سید مشہود حسن رضوی ''ہوبہو'' میں ہمیں بہت سی شخصیات کی تصویر کشی کرتے نظر آتے ہیں۔علی معین بلے نے ''بھگوا بھیس'' اختیار کر کے سب کو حیران کر دیا مگر پروفیسر قدرت اللہ شہزاد ''اجلے من کے لوگ'' اور ''جلتے بجھتے سورج'' لے کر جب ''صحرا چمکتا ہے'' کا اعلان کرتے ہیں تو سب کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں اور یہ چمک دمک سب کی نگاہوں کو خیرہ کر دیتی ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر مزمل بھٹی نے بھی صحرا مہکانے کی کوشش کی تھی مگر صحرا میں خوشبو زیادہ دیر ٹھہر نہیں پاتی اکثر بادِ صرصر کی نذر ہو جاتی ہے۔زاہد علی خان اور امیر عجم ملک ناول نگاری کے بعد اب خاکہ نگاری کے میدان میں جھنڈے گاڑ رہے ہیں۔ ستاروں کی اس کہکشاں میں ایک کونے میں قطبی تارے کی طرح روشن ناصر حسنی مسلسل اپنی کرنیں بکھیر رہا ہے اور یہ نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں۔

ناصر حسنی کے خاکوں کا جائزہ لینے سے پہلے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ خاکہ ہے کیا؟ اردو زبان میں خاکہ انگریزی کے لفظ (Sketch) کے مترادف ہے اور انگریزی ڈکشنری میں اس کے معنی ہیں:

"A Short report Or story that gives only basic details about some things.

یحییٰ امجد اپنی کتاب ''فن اور فیصلے'' میں خاکے کے بارے میں لکھتے ہیں: ''خاکہ ایک تخلیقی صنف ادب ہے، جس سے زندہ شخصیت، گوشت پوست کا بدن لیے علمیت کی بھاری بھرکم عباؤں کو دم بھر کے لیے اتار کر روزمرہ کے لباس میں نظر آتی ہیں اور انہیں ویسا دیکھتے ہیں جیسا وہ سچ مچ تھے۔نہ کہ جیسا ظاہر کرتے تھے۔''

بابائے اردو مولوی عبدالحق نے تو یہ کہہ کر بات ہی ختم کر دی کہ ''انسان کا بہترین مطالعہ انسان ہے۔'' ڈاکٹر جمیل جالبی خاکہ کے حوالے سے لکھتے ہیں'' خاکہ ایسی صنف ادب ہے جس میں کسی ایسے انسان کے خدوخال پیش کئے جائیں، کسی ایسی شخصیت کے نقوش ابھارے

جائیں جس سے لکھنے والا خلوت اور جلوت میں ملا ہو، اس کی عظمتوں اور لغزشوں سے واقف ہوا ہو۔ خاکہ نگاری ایک مشکل فن ہے۔ ہر لمحے آبگینوں کو ٹھیس لگنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ بقول محشر بدایوانی:

چہرہ تراشی کھیل نہیں ہے ہاتھ لہو ہو جاتے ہیں

بقول محمد طفیل: ''خاکہ نگاری خدائی حدود میں قدم رکھنے کے مترادف ہے یعنی جو کچھ خدا نے آپ کو بنایا ہوا اس کے عین اظہار کا نام خاکہ نگاری ہے۔''

اس قول کی روشنی میں شخصیت نگاری نہ تو عیب جوئی ہے اور نہ ہی عیب پوشی بلکہ کسی شخصیت کو ویسا ہی دکھا دینا جیسا وہ حقیقت میں ہے۔ نہ کہ جیسا وہ ظاہر میں نظر آتی ہے۔ خاکہ نگار کا کمال ہوتا ہے اور کسی شخصیت کو بیان کرنے کے لیے ذاتی تعلق اور گہرے مشاہدے کی ضرورت ہوتی ہے۔

ناصر حسنی نے بہت سی شخصیات کے خاکے تحریر کیے ہیں۔ کچھ سے ان کا تعلق بہت قریبی اور ذاتی رہا ہے اور کچھ خاکے مشاہدے اور مطالعے کے زور پر تحریر کیے گئے ہیں۔

ذاتی تعلق کی بنیاد پر لکھے گیے خاکوں میں جناب خورشید ناظر کا ''صورت خورشید'' سید تابش الوری کا ''پیکر محنت''، علی احمد رفعت کا ''دشت صحافت کا مسافر''، ظہور آثم کا ''سدا بہار'' اور منور جمیل کا ''مقتول قاتل'' خاصے کی چیزیں ہیں۔

ویسے تو نوشی گیلانی کا خاکہ ''چھوٹی بحر بڑی غزل'' بھی بہت خوب ہے مگر عورت ہونے کی وجہ سے ہم اسے صرف مشاہداتی خاکہ ہی کہہ سکتے ہیں۔ ذاتی تعلق بعید از قیاس ہے۔ جہاں تک مطالعاتی اور مشاہداتی خاکوں کا تعلق ہے تو صدر جنرل ضیاء الحق کا خاکہ ''سبز رتوں کا پیامبر'' ولی خان کا مت ولی''، ڈاکٹر انور سدید کا ''مرد آہن'' ڈاکٹر وزیر آغا کا ''اردو ادب کا ماوزے تنگ'' اور احمد ندیم قاسمی کا ''اقلیم سخن کا ابدالی'' بہت عمدہ خاکے ہیں۔ اس کے علاوہ ممتاز حسین بزمی کا خاکہ ''ادب دوست'' اور پنوں زادہ شاہ کا ''شاد باد'' بھی پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

عالیہ خان پر لکھا ہوا مضمون بھی خاکہ نگاری کی جھلک دکھاتا ہے اور عالیہ خان کی زندگی اور فن کی کچھ جہات ہمارے سامنے بے نقاب کرتا ہے۔

خاکہ نگاری میں شخصیت کا تعارف اور چہرے کے خدوخال سے ہی پڑھنے والوں کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ کس کے بارے میں بیان کیا جا رہا ہے۔ ناصر حسنی نے بھی سراپا نگاری پر خاص توجہ دی ہے۔ وزیر آغا کے بارے میں لکھتے ہیں:

''گداز جسم، سنہری رنگت، مناسب قد و قامت، نکھرا نکھرا چہرہ، روشن چمکدار آنکھیں۔ ہنسیں تو آنکھیں مسکرائیں۔ بولیں تو لب مکالمہ کریں۔ سر پر چائنا کیپ۔ اگر موصوف کی آنکھیں چندھیائی ہوئی ہوتیں تو دیکھنے والے ان کو چین کے مایہ ناز سپورٹ ''ماوزے تنگ'' کی کاربن کاپی سمجھتے۔''

اسی طرح ''محنت'' کے حوالے سے لکھتے ہیں؛

''نرم مزاجی، نرم خوئی اور شائستگی کی ترتیب جب سانچے میں ڈھلتی ہے تو تابش الوری ایسے افراد وجود میں آتے ہیں۔ ان کی تیز رفتاری ضرب المثل ہے لیکن چال ایسی سبک، ایسی خوش خرام ہے کہ کہیں جا رہے ہوں تو پتہ ہی نہیں چلتا کہ چل رہے ہیں یا چہل قدمی کر رہے ہیں۔ محو گفتگو ہوتے ہیں تو ان کے ہاتھوں کی حرکات وسکنات قابل دید ہوتی ہیں۔ ہاتھ اور زبان کی سنگت سے ایسا سنگیت پیدا کرتے ہیں کہ سماعتیں گنگ اور آنکھیں پتھرا جاتی ہیں۔''

''قاتل اور مقتول'' میں منور جمیل کے بارے میں لکھتے ہیں کہ منور جمیل قریشی کو جب بھی دیکھا، یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ وہ منور زیادہ ہیں یا جمیل۔ صورت کے اعتبار سے جمیل ہیں اور سیرت کے اعتبار سے منور ہیں۔ گندمی رنگت۔ ابھرے ابھرے نقش و نگار۔ متناسب اعضاء۔ مناسب قد و قامت۔ بولتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے چہک رہے ہوں۔''

اور اب ذرا یہ بھی دیکھئے ''دراز قد، متناسب اعضاء، تیکھے نقش و نگار، ذہانت کی آئینہ دار آنکھیں، کشادہ پیشانی، سر پر بالوں کا گھنا جنگل۔ جوان کے لہو کے درجہ کھولاؤ کو معتدل رکھتا ہے۔

تیکھی ناک جو موصوف کے تیکھے ہونے کے علاوہ ''ناک والا'' ہونے کی علامت بھی ہے۔ چہرے پر ایک لمبا سا نشان جو خطِ مستقیم کی طرح ایستادہ ہے جسے ان کے مخالفین ان کے جھگڑالو اور فسادی ہونے کی دلیل قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ وہ لوح و قلم کے آدمی ہے۔ توپ و تفنگ سے ان کا کوئی تعلق نہیں''

جی ہاں! آپ کا خیال سو فیصد درست ہے۔ یہ قلمی خاکہ، یہ لفظی پیکر۔ اردو کی وی۔ آئی۔ پی شخصیت واجب التسلیم اور قابل احترام احمد ندیم قاسم کی ہے۔

یہ چند مثالیں میں نے اس لیے دیں تا کہ یہ ثابت کرسکوں کہ ناصر حسنی جب کسی کا خاکہ لکھتے ہیں تو اس کے تعارف اور سراپا نگاری کا انداز کیا ہوتا ہے جو کہ ایک بڑے خاکہ نگار کی پہچان ہے۔ خاکہ پورٹریٹ نہیں ہوتا بلکہ پنسل سے بنائی گئی تصویر ہوتی ہے جو کسی شخصیت کے خدوخال کو ہمارت سامنے پیش کرتی ہے اور اس کے چہرے کی لکیریں اس کے کردار اور افکار کو ظاہر کرتی ہیں۔ اور خاکہ نگار ایک غیر جانبدار فنکار کی طرح حقیقت بیان کر دیتا ہے۔ ناصر حسنی بھی بڑے اختصار کے ساتھ ہمارے سامنے بڑی بڑی قدآور شخصیات کی ایسی تصویر کشی کرتے ہیں کہ وہ چلتی پھرتی بولتی اور سانس لیتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ وہ سعادت حسن منٹو کی طرح ان تصاویر کو عریاں کرنے کی کوشش نہیں کرتے اور نہ ہی ان کے عیب بیان کر کے انھیں شرمندہ کرتے ہیں: ''لوگ علم حاصل کرنے چین جاتے ہیں یہ علم کے زور پر چین گئے۔''

''قاسمی صاحب ایک با کمال فن کار ہی نہیں با کمال انسان بھی ہیں، ترقی پسندوں میں ترقی پسند اور اسلام پسندوں میں اسلام پسند ہیں۔'' اسی طرح ولی خان کے بارے میں لکھا کہ ''ولی خان نے تمام عمر بے داغ سیاست کی۔''

اپنے دوست خورشید ناظر کے بارے میں ان کی رائے ہے کہ ''خورشید ناظر کا شمار پڑھے لکھے افراد میں ہوتا ہے۔ انھوں نے ڈگری کے ساتھ تعلیم بھی حاصل کی ہے۔'' اور پھر کہا کہ'' لفظوں کے باطن میں جھانکنے کا ہنر کوئی کوئی جانتا ہے اور خورشید ناظر اس فن میں ید طولیٰ رکھتے

ہیں۔''

''ناصر حسنی کے قلم میں کاٹ ہے۔'' یہ چھوٹے چھوٹے جملوں سے بڑے بڑوں کو رقص بسمل پر مجبور کر دیتا ہے۔صدر ضیاء الحق کے عہد میں ان کو سبز رتوں کا پیامبر قرار دیتے ہوئے کیا چوٹ کی ہے۔''مقدر کے سکندر ہیں۔تقدیر نے جنرل بنایا مگر یہ اپنی جدوجہد سے''صدر مملکت'' کے عہدہ پر بھی فائز ہیں۔اگر فرش بیت اللہ کو اپنے اشکوں سے دھونا باعث نجات گردانتے ہیں تو دوسری طرف مندر کی گھنٹیاں ہلانے کو بھی کامیابی کی کلید سمجھتے ہیں''

''ان کے کارہائے نمایاں کی تفصیل جرنیلی سڑک سے بھی زیادہ طویل ہے۔''

غیر کاروباری ہونے کے باوجود گلشن کا کاروبار چلا رہے ہیں۔'' اب وہ سنجیدہ کام کرتے وقت بھی سنجیدہ ہو جاتے ہیں۔یہی وجہ ہے لہ بعض محکموں میں ایسے افراد بھی پائے جاتے ہیں جو اپنے شعبہ کی الف۔ب سے بھی آگاہ نہیں۔''

کسی جنرل کے بارے میں جو کہ صدر مملکت بھی ہو،ایسے جملے نوک قلم پر لانا ناصر حسنی جیسے سپاہی کا کام ہی ہوسکتا ہے جو اس کے بہادر اور جی دار ہونے کا ثبوت ہے۔جی داری کے ثبوت تو اس نے عملی زندگی میں بھی دیے ہیں جب کہ ایک ریٹائرڈ حوالدار ہوتے ہوئے کور کمانڈر کو بے بسی کی تصویر بنا دیا تھا۔خیر یہ ایک الگ کہانی ہے جس کا تعلق اس کی خاکہ نگاری سے نہیں۔ مگر بہادری سے ضرور ہے۔بہادری کے قصے تو اور بھی ہے ایک آدھ سن لیجئے:

جب''مرد آہن''میں اس نے منور جمیل اور نوشی گیلانی کا ذکر بھی انور سدید اور وزیر آغا کی جوڑی کے ساتھ کر دیا تھا تو پورا قلم قبیلہ اسے لائق رسن ودار سمجھنے لگا تھا۔مگر اس نے پیٹھ نہیں دکھائی اور معاملہ''قاتل،مقتول'' تک جا پہنچا تو انہوں نے لکھا کہ''منور جمیل اچھے دوست ہیں مگر ان کے جوہر دشمنی میں کھل کر سامنے آئے ہیں۔''

ناصر حسنی بہت شریر ہیں۔انہیں سادہ سا لباس اور سائیکل کے ساتھ لٹکے ہوئے تھیلے کے ساتھ دیکھنے والے معصوم سمجھتے ہیں مگر یہ تھیلا عمرو عیار کی زنبیل کی طرح ہے کسی وقت کچھ بھی نکل

سکتا ہے۔اس میں سے وہ خود کہتے ہیں کہ ''خاکہ نگاری میں شرارت نگاری کا عضر نہ ہوتو خاکہ لکھنے اور خاک اڑانے میں کوئی فرق نہیں رہتا۔''اور ناصر حسنی خاک بہرحال نہیں اڑاتے خاکہ لکھتے ہیں۔

اب ذرا ان کی شرارت ملاحظہ فرمایئے۔''قاتل اور مقتول'' کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: اب تک تو یہی سنتے آئے تھے کہ عشق آدمی کو شاعر بنا دیتا ہے مگر ہماری آنکھوں نے یہ منظر بھی دیکھا ہے کہ عشق نے شاعر کو آدمی بنا دیا ہے۔منور جمیل قریشی اچھے بھلے شاعر تھے۔شاعری کرنا، مشاعرے کرانا اور ادبی تقاریب منعقد کرنا ہی ان کا نصب العین تھا۔ پھر یوں ہوا کہ انہیں ایک سانولی سلونی لڑکی سے عشق ہو گیا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ عشق کی بھٹی سے کندن بن کر نکلتے مگر یوں ہوا کہ عشق کی تپش نے ان کی شاعری کو جھلسا دیا۔''

میرے خیال میں یہ ناصر حسنی کی شرارت نگاری ہے اور بس! منور بھائی نے تو اپنے خواب عدالت تک کو دکھا دیے تھے۔ یہ اور بات کہ ''ضدی لڑکی بات نہ مانے موسم کی۔''

ایک کہنہ مشق خاکہ نگار ہونے کی حیثیت سے ناصر حسنی نے ایسی شخصیات کے بارے میں لکھا ہے جن سے ان کا گہرا ذاتی تعلق ہے۔ اسی لئے ان خاکوں میں حقیقت کا رنگ جھلکتا ہے۔ظہور آثم کے خاکے ''سدا بہار'' اور ''صورت خورشید'' میں خورشید ناظر کے حوالے سے ان کے تاثرات بہت گہرے ہیں۔

چھوٹی بحر بڑی غزل میں سلیم شہزاد اور منور جمیل قریشی کے حوالے سے لکھتے ہیں ''منور جمیل قریشی نے سلیم شہزاد کی کھوں کھوں سے تنگ آ کر کہا یار تم یہ ''سگریٹ نوشی'' چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟ میں سگریٹ چھوڑ سکتا ہوں مگر۔۔۔

مگر کیا؟ قریشی صاحب نے اپنی آنکھوں کی کشادگی میں مزید اضافہ کرتے ہوئے استفسار کیا۔ یہ کہ تم ''نوشی'' کو چھوڑ دو۔ یہ جملہ ان کے مشاہدے اور تعلق کی گہرائی اور گیرائی کا پتا دیتا ہے۔ وزیر آغا، انور سدید اور احمد ندیم قاسمی کے خاکوں میں بھی ان کے گہرے مشاہدے کا

کمال نظر آتا ہے۔

خورشید ناظر نے پیشین گوئی کی تھی کہ ایک وقت آئے گا جب ناصر حسنی کے افسانچوں پر ایم۔فل کیا جائے گا اور یہ بات سچ ہوئی۔ میرا خیال ہے کہ ناصر حسنی کی خاکہ نگاری پر بھی ایم۔فل ہونا چاہیے کیوں کہ وہ پاکستان میں خاکہ لکھنے والے ان چند سچے قلم کاروں میں شمار کیے جاسکتے ہیں جو اونچے عہدوں پر تو فائز نہیں اور نہ ہی سرکار دربار میں ان کی پہنچ ہے مگر وہ قلم میں روشنائی کی جگہ خونِ جگر سے اس فن کی آبیاری کر رہے ہیں۔

کل ماتم بے قیمت ہوگا آج ان کی توقیر کرو
خونِ جگر سے کیا کیا یارو لکھتے ہیں افسانے لوگ

خاکہ نگاری کی ایک نئی جہت

ناصر حسنی

تحریر: ذیشان اطہر

صد ہا داد و مبارک باد کہ ناصر حسنی کی شخصی خاکوں پر مشتمل کتاب شائع ہو چکی ہے۔ یہ اور بات کہ اس خبر کے عام ہوتے ہی جن شخصیات کے خاکے اس کتاب کی زینت بن رہے ہیں، وہ کتاب چھپنے سے پہلے ہی چھپ رہے ہیں۔ اس جملے کا سیاق و سباق اور معنویت تو آپ پر یہ کتاب پڑھنے کے بعد ہی کھلے گی۔ سر دست یہاں مجھے ناصر حسنی اور اس کی خاکہ نگاری کے حوالے سے چند باتیں کرنا ہیں۔

یوں تو اردو دنیا میں ایسی بہت سی نامور ہستیاں گزری ہیں جنہوں نے بیک وقت، ادب اور صحافت دونوں میدانوں میں اپنے قلم کے جوہر دکھائے اور منوائے ہیں۔ دور کیوں جائیں، دبستان بہاول پور ہی میں شہاب دہلوی، سید آل احمد، علی احمد رفعت، سید تابش الوری، سہیل اختر، امجد قریشی، مرزا نعیم اختر، خورشید ناظر، ظہور آثم، منور جمیل قریشی وغیرہ ایسے اہل قلم ہیں جنہوں نے صحافت کی چولی کے ساتھ ادب کا دامن بھی مضبوطی سے تھامے رکھا ہے مگر یہاں ناصر حسنی کی بات ہے وہ اس گروہ کا واحد ایسا لکھاری ہے جس نے اپنی تخلیقی چمک اور اسلوبی دمک سے اس چولی اور دامن کو سرکا سرکا کر ایسے مناظر کو بھی دیکھنے اور دکھانے کی کاوش کی ہے، جنہیں دوسرے صرف چوم کر چھوڑ دینے پر اکتفا کرتے ہیں۔

ناصر حسنی کی افسانوں اور افسانچوں پر مشتمل کتاب ''مردہ شہر کا زندہ آدمی'' گزشتہ برس شائع ہو کر اہل فکر و نظر سے داد و تحسین پا چکی ہے اور اب وہ اپنے بیشتر مطبوعہ اور کچھ غیر مطبوعہ شخصی خاکوں کی کتاب بعنوان ''پسِ آئینہ'' ادبی دنیا کے سامنے پورے اعتماد اور اعتبار کے ساتھ پیش کر رہا ہے۔

اس میں کوئی دورائے نہیں ہوسکتی کہ ناصر حسنی ایک کامیاب کالم نگار، افسانہ نگار اور خاکہ نگار ہے۔ کامیابی کی دیگر وجوہ کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس کی قلم پر پکڑ بہت مضبوط ہے۔ اس بات کی گواہی قارئین کے ساتھ ساتھ وہ احباب بھی دیتے ہیں جو اس کی ''پکڑ'' میں آتے ہیں۔ ناصر حسنی کے انداز واسلوب کا مرکز اس کی جملہ سازی ہے۔ وہ صنعت ابہام سے مزین، مدوح کی تحت الشعوری کو سامنے لاتا ہے، کاٹ دار جملہ کہنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ سنتے ہیں کہ ایک زمانے میں وہ شاعری کا شوق بھی رکھتا تھا۔ اگر وہ طبع آزمائی جاری رکھے تو مجھے یقین ہے کہ وہ صنف غزل کا ایک تیکھا شاعر ہوتا کیونکہ اس کے نثری جملے بھی اپنے اندر غزل کے کسی پہلودار شعر کا سا اثر رکھتے ہیں، جنہیں سن کر لوگ حال میں اور جس کے بارے میں کہا گیا ہو، وہ اس کے جال میں ''شمع سحر'' کی مانند سر دُھنتا نظر آتا ہے۔

خاکہ نگاری ایک مشکل فن ہے کہ ذرا سی قلم کی زبان پھسلنے سے خاکہ نگار، خاکہ کھینچنے سے خاک اڑانے کی ممنوعہ حدود میں داخل ہوسکتا ہے۔ ہر چند کہ مرزا فرحت اللہ بیگ، مولوی عبدالحق، چراغ حسن حسرت، عبدالمجید سالک، سعادت حسن منٹو، رشید احمد صدیقی، محمد طفیل، اشرف صبوحی اور احمد بشیر جیسے جید اور مسلّم خاکہ نگاروں نے اس صنف کو ایسی بلندیاں عطا کی ہیں کہ اب اس قطار میں نمایاں ہونے کیلئے متاخرین کو اپنی ایڑیاں اٹھانا پڑیں گی مگر وہ جو کہتے ہیں کہ بہتر کی گنجائش ہر وقت اور ہر جگہ موجود ہوتی ہے، اس کا ایک مظہر یہ شخص و کتاب ہے۔

ناصر حسنی کے بیشتر مدوح میدانِ ادب وصحافت کے شہسوار ہیں اور ان میں سے اکثر یت کا تعلق دبستان بہاول پور سے ہے کہ جن کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے، لکھتے پڑھتے، ملتے ملاتے، ہنستے ہنساتے اس نے اپنی زندگی کا ایک طویل عرصہ گزارا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ان شخصیات کے سراپا کے بیان میں چند جملوں میں تصویر کھینچنے کا مرحلہ سر کر لیتا ہے اور حالات وواقعات کے ذکر میں بین السطور ایسے اشارے کرتا ہے جو ہر دو شخصیات (ممدوح ومداح) کو جاننے والوں کے لطف کو دوآتشہ کر دیتے ہیں، گو کہ ناصر حسنی نے زیادہ تر انہیں لوگوں کے خاکے لکھے ہیں جن سے وہ

ملا ہے مگر جگہ جگہ پھلجڑ یوں کی مانند چھوٹتے اس کے جملے بتاتے ہیں کہ وہ ان سے ''ملا ہوا'' ہرگز نہیں ہے۔

جن ادبی شخصیات پر موصوف نے قلم فرمائی کی ہے، ان میں احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر انور سدید، پروفیسر عابد صدیق، علی احمد رفعت، پروفیسر سہیل اختر، ظفر اقبال، سید تابش الوری، منور جمیل قریشی، ظہور نظر، پنوں زادہ شاد، ممتاز حسین بزمی، ڈاکٹر نواز کاوش، ڈاکٹر فرحت عباس، ظہور آثم، نوشی گیلانی اور ڈاکٹر نجیب جمال کے خاکے اہم ہیں جبکہ ادبی وصحافتی شخصیت میں سعید احمد مدیر پندرہ روزہ ''حقیقت''، فضل حمید احمد، قاسم رشید فاروقی، عالیہ خان اور سیاسی شخصیات میں جنرل ضیاء الحق اور ولی خان کے خاکے قابل ذکر ہیں۔

ناصر حسنی کے تحریر کردہ خاکے تو خاصے کی چیز ہوتے ہی ہیں۔ ان کے عنوانات بھی اپنے اندر انفرادیت اور دلچسپی اور مذکورہ ممدوح کی شخصیات کی مرکزی صفت کی طرف اشارہ کرتے نظر آتے ہیں۔ اپنی بات کے ثبوت میں بطور نظیر میں یہاں اس کے چند خاکوں کے عنوانات درج کرتا ہوں۔ مثلاً احمد ندیم قاسمی کیلئے ''اقلیم سخن کا ابدالی''، ڈاکٹر وزیر آغا کیلئے ''اردو ادب کا ماؤزے تنگ''، ظہور نظر کیلئے ''ملحد''، نوشی گیلانی کیلئے ''چھوٹے بحر بڑی غزل''، ڈاکٹر نجیب جمال کیلئے ''جمالِ ادب''، منور جمیل قریشی کیلئے ''قاتل مقتول''، عالیہ خان کیلئے ''ایتا بچن کا چھوٹو''، ڈاکٹر فرحت عباس کیلئے ''منڈا پیر'' اور سعید احمد کے خاکے کو ''خودساز کا عنوان'' دینا وغیرہ۔ یہ عنوانات پورے خاکے کی مختصر تلخیص کا درجہ رکھتے ہیں بلکہ خاکے کے مزاج اور خاکہ نگار کے موڈ کا بھی اعلان کرتے نظر آتے ہیں۔

ناصر حسنی اپنی جملہ تحریروں کے آئینے میں وہ ظالم و بے باک لکھاری ہیں جس کی باریک و دوربین نظر اپنے ممدوح کی ان صفات کو بھی سامنے لانے کا ہنر جانتی ہے جن سے بسا اوقات خود وہ شخص بھی پوری طرح آشنا نہیں ہوتا۔ اس کے تحریر کردہ خاکوں کی دیگر خصوصیات میں سراپا نگاری، ایجاز و اختصار، ایمائیت، پہلوداری، ذومعنویت، بے باکی، زہر ہلاہل کو قند نہ کہنا اور

زبان خلق کونقارہ خداسمجھنا اہم ہیں۔وہ ایک ایسا ذہین،ضدی،مناظرہ باز ہے جواپنے ممدوح کے شخصی اوصاف، اخلاقی خصائل، زندگی کے واقعات اور معاشرے میں اس کے بارے میں پائی جانے والی آراء اور افواہوں تک کو اپنے طے کردہ فریم میں اس طرح فکس کرتا چلا جاتا ہے کہ ممدوح کے ''فکس'' ہونے میں کوئی کسر باقی نہیں رہ جاتی۔کم وبیش ہر خاکے میں اس نے اپنے مخصوص انداز میں (جسے میں ناصر حسنی کا ہنسنا سے تعبیر کرتا ہوں) موصوف کی کسی شخصی صفت کی طرف اس طرح اشارہ کیا ہے۔

کہ کہیں کہیں تحریر کا آبگینہ تندی صحبا سے پگھلنے لگا ہے۔ایسے ہشت پہلو تب وتاب کے حامل جملے اس کے یہاں بہت ارزاں وعام ہیں۔ناصر حسنی کے ان خاکوں کو پڑھتے ہوئے مجھے بار بار منور جمیل قریشی کا وہ تاریخی جملہ یاد آتا رہا جو ناصر حسنی کے مسلکِ خاکہ نگاری پر پوری طرح صادق آتا ہے کہ:''بندہ ضائع ہوجائے مگر جملہ ضائع نہیں ہونا چاہیے۔''اوراب ان کے تحریر کردہ چنیدہ خاکوں کے چند چنیدہ جملے دیکھئے:

''قاسمی صاحب باکمال انسان ہی نہیں ایک باکمال فنکار بھی ہیں،وہ ترقی پسندوں میں ترقی پسند اوراسلام پسندوں میں اسلام پسند ہیں۔

کچھ عرصہ قبل اکادمی ادبیات پاکستان کی جانب سے عالمی ادبی کانفرنس کا انعقاد کیا گیا تھا، جہاں احمد ندیم قاسمی نے اردو مقالہ پڑھ کر بہت سے اردو کے ادیبوں کا منہ کالا کردیا تھا اور سونے پرسہاگہ یہ کہ روسی مندوب نے اردو میں مقالہ سنا کر بہت سے پاکستانی ادیبوں کو عرق ندامت میں غرق کردیا تھا۔''(اقلیم سخن کا ابدالی۔احمد ندیم قاسمی)

''ہمارے ہاں جو سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں ان کا تعلق خودانکشافی سے زیادہ خودنمائی سے ہوتا ہے جبکہ آغا جی نے اپنی سوانحی عمری میں اپنے باطن کو عیاں کرنے کی کوشش کی ہے۔آغا جی کے بعض بدطنیت نقادسرقے کا الزام بھی لگاتے ہیں، جو سراسر غلط ہے کیونکہ اس طرح تحریر و تحقیق وتنقیداورمقالہ نگارمسروق قرار پائے گا کہ ادھرادھر کے مال پر ہاتھ صاف کئے بغیر نہ تو تحقیق

مکمل ہوسکتی ہے نہ مقالہ۔'' (اردو ادب کا ماؤزے تنگ۔ڈاکٹر وزیر آغا)

''موصوف کی کتابوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ اونٹ پر لادی جاسکتی ہے۔

انور سدید نے لاشعوری طور پر وزیر آغا کے باڈی گارڈ کی ڈیوٹی سنبھالی ہوتی ہے اور ان کو تنقیدی یلغار سے اس طرح محفوظ رکھتا ہے، جس طرح مرغی چیل کے سفاک پنجوں سے چوزے کو بچا کے رکھتی ہے۔'' (مرد آہن، انور سدید)

''پروفیسر عابد صدیق اہل کتاب تو پہلے ہی تھے اب صاحب کتاب بھی ہوگئے ہیں۔'' (عابد شب بیدار، عابد صدیق)

''اسم باسمی ہیں نجیب بھی ہیں اور باجمال بھی۔غالباً نجیب نام ہے اور جمال ان کا تخلص ہے۔اب یہ الگ بات ہے کہ تنقید و تحقیق اور تدریس سے ایسی نبھی کہ شاعری کو طلاق دینا پڑی۔

عوام و خواص سبھی ''ز'' کی تثلیث کے پجاری ہیں، ان کی زندگی کا محور زر، زن، زمین کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا مگر ڈاکٹر نجیب جمال کو یہ فوقیت حاصل ہے کہ ان کی زندگی کا مطلوب و مقصود تین ''ت'' ہیں، تنقید، تحقیق اور تدریس۔'' (جمالِ ادب، ڈاکٹر نجیب جمال)

''اگر سگریٹ واقعی نوش کیا جاتا ہے تو ان کو بلانوش کہا جاسکتا ہے کہ ہمہ وقت ان کی انگلیوں میں سلگتا سگریٹ ''تو چل میں آیا'' کا ورد کرتا رہتا ہے۔'' (صائب الرائے، پروفیسر سہیل اختر)

''بھارت کے ذرائع ابلاغ سے ظہور نظر کی شاعرانہ عظمت کو خراج تحسین پیش کیا جارہا تھا اور ٹیکنیکل ہائی اسکول بہاول پور میں ظہور نظر کی میت نماز جنازہ کی منتظر تھی۔لوگوں کا کہنا تھا کہ ظہور نظر قادیانی تھا، اس لیے اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھائی جاسکتی۔ظہور نظر زندہ تھے تو بہاول پور کا ہر شخص انہیں ماما کہتا تھا، مگر آج کوئی بھانجا نمازِ جنازہ پڑھنے کیلئے تیار نہ تھا۔'' (ملحد ظہور نظر)

''آئینے سے عشق انسان کی کمزوری ہے مگر تابش الوری اپنی آواز کے سحر میں مبتلا ہیں۔'' (پیکر محنت، تابش الوری)

’’منور جمیل قریشی نے سلیم شہزاد کی کھوں کھوں سے تنگ آ کر کہا: ’’یار! تم یہ سگریٹ نوشی چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔‘‘ ’’میں سگریٹ چھوڑ سکتا ہوں مگر؟‘‘

’’مگر کیا؟؟‘‘ ’’یہ کہ تم نوشی چھوڑ دو۔‘‘ سلیم شہزاد نے سگریٹ چھوڑی نہ منور جمیل قریشی نے نوشی مگر دو دوستوں نے ایک دوسرے کو چھوڑ دیا۔‘‘ (چھوٹی بحر، بڑی غزل، نوشی گیلانی)

’’ظفر اقبال بڑے فراغ دل ناقد ہیں، صاحب کتاب کی غلطیاں نہیں نکالتے، صاحبِ کتاب ہی کو نکال دیتے ہیں۔ بہت اچھے مہمان نواز ہیں جو ایک بار اُن کا دال دلیہ کھالے، پراٹھے، آملیٹ کو بھول جاتا ہے۔‘‘ (نئ غزل کا پیمبر، ظفر اقبال)

’’ہمارے ہاں دو قسم کے شاعر پائے جاتے ہیں۔ ایک قسم قلموں والے شاعروں کی ہے، دوسری قسم قلم والوں کی ہوتی ہے۔ موصوف کا تعلق تیسری قسم سے ہے۔ ظہور آثم کو اس بات پر خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ شاعروں کی تیسری قسم نہیں ہوتی۔‘‘ (سدا بہار، ظہور آثم)

’’ادب سے زیادہ ادیب پرور ہیں اور اگر ادیب یا شاعر کا تعلق صنف نازک سے ہو تو پھر ان کے ذہن رسا کی نزاکتیں اپنے عروج پر ہوتی ہیں۔‘‘ (ادب دوست، ممتاز حسین بزمی)

’’وہ جب تک خاندانی منصوبہ بندی کے محکمے سے وابستہ رہے، ان کی شریک حیات غوں غاں کی آواز کو ترستی رہی مگر جب ان کے محکمے نے ان سے آنکھیں پھیر لیں اور وہ جمع تفریق کے چکر میں پڑے تو ان کی بیگم کے ستارے بھی گردش سے نکل آئے اب وہ خیر سے صاحب اولاد ہیں۔‘‘ (مرد رشید، قاسم رشید فاروقی)

’’فرحت عباس کی ساری شخصیت اس کے نام کے زیر اثر ہے۔ اس کے نام کا پہلا حصہ واقعی فرحت بخش ہے، وہ فرحت کشید کرنے کا ہنر جانتا ہے۔ اب یہ ایک الگ بات ہے کہ وہ فرحت کو گنڈیریوں کی طرح کشید کرتا رہتا ہے۔ اس کے نام کا دوسرا حصہ ’’عباس‘‘ حق وصداقت کا علم بلند رکھنے کی علامت ہے مگر ہم اس کے قلم بردار ہونے کے گواہ ہیں۔‘‘ (منڈا پیر، ڈاکٹر فرحت عباس)

''یوں تو جمیل بھائی اپنی ذات میں انجمن ہیں مگر اس کے باوجود انجمن سازی کا شوق ہے۔شوق کا کوئی مول نہیں ہوتا، جہاں مول نہیں نہیں ہوتا، وہاں تول کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔مگر جمیل بھائی کی خوبی یہ ہے کہ بغیر مول کے تول کا توازن اپنے حق میں رکھتے ہیں۔'' (مقتول قاتل، منور جمیل)

قارئین! معذرت خواہ ہوں کہ منتخب جملوں کا انتخاب کچھ طویل ہوگیا ہے جبکہ ایسے بہت سے شوق و شریر جملے ہیں، جنہیں خوفِ فسادِ خلق سے نقل کرنے سے معذور ہوں جنہیں آپ کتاب کے مطالعے کے دوران پڑھ کر یقیناً محظوظ ہوں گے۔

مختصر یہ کہ ناصر حسنی خاکہ نگاری کے تمام اسرار و رموز سے آگاہ اور ان تمام اوصاف سے متصف خاکہ نگار ہے جو کسی بھی ادیب کو اعلیٰ مقام پر فائز کرتے ہیں۔اس کے خاکے سراپا نگاری، عادات و اطوار، ممدوح کی زندگی کے قابل ذکر حالات و واقعات اور ذاتی میل ملاقات کے تانے بانے سے گندھے نظر آتے ہیں۔سب سے بڑھ کر اس کی باریک بین نظر، اس کا منفرد کاٹ دار اسلوب ہے کہ جس کا کاٹا بار بار پانی مانگتا ہے۔

آخر میں اردو ادب کو ہمہ رنگ تخلیقی خاکوں کا تحفہ دینے اور کتاب چھپنے پر ناصر حسنی کو مبارکباد، خاکوں کا موضوع بننے والی شخصیات سے ہمدردی اور کتاب خرید کر پڑھنے والوں کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں۔

ناصر حسنی کی خاکہ نگاری

تحریر: فاروق عمر خان

میری تساؤ(Marie Tussaud) باہر کھڑیں تھیں مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ یہاں تو کمال کے لوگ تھے۔ میرے سامنے مکھی نما موچھوں والے ایڈ وولف ہٹلر تھے۔ دوسری طرف نلسن منڈیلا تھے۔ عجب تضاد تھا ایک امن دشمن دوسرا امن کا پجاری۔ یہ سب خاموش تھے البتہ ان کے غنچہ دھن اور باریک ہونٹوں کا مطلب سمجھ سکتے۔ ستواں ناک اور تنگ پیشانی سے کوئی مطلب اخذ کر سکتے۔ چمکتی آنکھیں اور اُبھرے گالوں سے کوئی کہانی گھڑ سکتے۔ اس مومی عجائب گھر میں ہمیں کھلاڑی بھی نظر آئے اور سیاست دان بھی، یہاں سائنس دان بھی تھے اور فلمی شخصیات بھی۔ عجب رونق گاہ تھی۔ مگر خاموش..........ان کو کون بتائے کہ اپنے پیکر مومی میں جاں پیدا کرو تب ہی ان کی شخصیت کو پرکھا جاسکے گا۔ یہ بات تو سقراط نے بھی اپنی مجلس میں خاموش بیٹھے ہوئے ایک اجنبی سے کی تھی کہ بولئے جناب تاکہ میں آپ کی قابلیت کا اندازہ لگا سکوں۔ کاش ان موم کی پتلیوں کے احوال و آثار بھی تحریر کر دیئے جاتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ مادام تساؤ اگر سرسوتی دیوی کا مجسمہ لگا دیتی تو کیا عجب ہے کہ سب مورتیوں کے ہاتھ میں ان کے شخصی خاکے بھی ہوتے۔

اس میں شک نہیں کہ Wax Portraits کی اپنی قدر و قیمت ہے لیکن Pen Portraits یعنی ''خاکے'' بھی اہل فن سے داد وصول کر رہے ہیں۔ خاکہ نگاری بھی لفظوں میں تصویر کشی کے مترادف ہے۔ جب کوئی لکھاری کسی فرد کی حالت ظاہری اور باطنی کو بے کم و کاست لفظوں کا پیراہن عطا کرتا ہے تو خاکہ بنتا ہے۔ تخیل کی ہلکی سی رمق بھی خاکے کے رنگ کو پھیکا نہیں پڑنے دیتی۔ خاکے میں، حقیقی زندگی کی جتنی زیادہ چمک دمک ہوگی اتنی ہی اس کی قدر و منزلت میں اضافہ ہوگا۔ ماضی کے زرد پتے اور حال کی کونپلیں خاکے کے کینوس پر بکھر کر فکر کے نئے دریچے

کھولتے ہیں۔ زندگی کی دھوپ چھاؤں، بہار اور خزاں کے تذکرے بھی خاکہ نگار کی تصویر کو دھنک رنگوں کی مالا عطا کرتے ہیں۔ مرزا فرحت اللہ بیگ، سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی کے نام خاکہ نگاری میں اہمیت کے حامل ہیں دور حاضر کے بہت سے لکھاری بھی شخصیت نگاری میں نامور ہیں لیکن شخصی مرقع لکھتے ہوئے ہر قلمکار نے اپنی روش تحریر کو ہی معتبر جانا اور خاکہ نگاری کی مروجہ تعریف کو راہنما نہیں بنایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شخصیہ نگاری کی کوئی متعین تعریف نہیں ہے۔ اس لئے قلمی تصویر میں کبھی عادات واطوار ابھر کر سامنے آتے ہیں تو کبھی مزاج۔ کہیں چہرے مہرے کے رنگ تیکھے ہو جاتے ہیں اور کہیں افتاد طبع اور چال ڈھال کی دلکشی میں فرق آ جاتا ہے۔ اس کا سبب خاکہ نگار کی اپنی فنی بصیرت اور قوت متخیلہ ہے۔

ناصر حسنی بھی لفظوں کا کھلاڑی ہے۔ وہ بھی قلمی تصویریں بناتا رہتا ہے، وہ بھی اپنے غبار فکر کو تحریر کرتا رہتا ہے۔ اس کے مشاہدات اور تجربات کی پٹچی میں بہت سے خاکے ہیں اور قومی اخبارات میں شائع شدہ کالموں کے ان گنت ورق ہیں۔ افسانوں کا بھی ایک دفتر ہے۔ اس کی پٹچی کریدیں تو آپ کو افسانچوں کی ایک کتاب ''مردہ شہر کا زندہ آدمی'' بھی مل جائے گی۔ اس کی یہ کتاب منصۂ شہود پر آ کر اہل علم سے داد وصول کر چکی ہے۔

ناصر حسنی کا ادبی ہنر اسے سنگلاخ راستوں کے سفر پر اکساتا ہے۔ وہ مروجہ روش سے ہٹ کر خاکے تحریر کرتا ہے۔ وہ بدزبان نہیں ہے۔ شوخ زبان ضرور ہے۔ اس کے خاکوں سے صداقت کی مہک آتی ہے۔ وہ لفظوں کی کہکشاں نہیں بچھاتا۔ وہ اپنے مرقع میں نہ تو کسی کی تنقیص کرتا ہے اور نہ ہی تقریظ بس وہ جیسا سمجھتا ہے لکھ دیتا ہے۔ شاید اس لئے کہ:

نا جانے کونسا خاکہ کمال فن ٹھہرے
ہر اک خیال کو تصویر کرتا رہتا ہوں

اس کے یہ تصویری پیکر اخبارات اور رسائل کی زینت بنتے رہتے ہیں۔ پٹھان ہوتے ہوئے بھی اس کی باتوں میں شگفتگی ہے، ہوسکتا ہے لفظوں کا کھردرا پن کہیں قاری کو محسوس ہو۔ اس

کا سبب وہ شخصیت ہے جس کا وہ مرقع تحریر کر رہا ہے۔ وہ جھٹ پٹ ہر کس و ناکس کا خاکہ تحریر نہیں کرتا ہے بلکہ اپنے مشاہدے کو سامنے رکھتا ہے اور اس فرد کا تفصیلی مطالعہ کرنے کی کوشش کرتا ہے تب کہیں جا کر وہ شخصیہ لکھتا ہے پھر اس کے جملوں سے وہ کنول کھل اٹھتے ہیں جن کی تازگی ہمارے مشام جاں کو معطر کرتی ہے۔ بعض اوقات وہ ہوشیاری سے سندر جملوں کا ایسا جال بنتا ہے کہ جن کے استعارے آپ کے طائر خیال کو بھٹکا بھی سکتے ہیں۔ وہ کسی کردار پر قلم اٹھاتا ہے تو حسب مراتب اور حسب توفیق چھیڑ چھاڑ ضرور کرتا ہے۔ وہ ناگوار اور خوشگوار واقعات کو بھی فقروں کے تھال میں رکھ کر اپنے قارئین کو پروستا ہے۔ اس کے خاکوں کے نام بھی اپنے اندر انفرادیت رکھتے ہیں۔ چند نام ملاحظہ فرمائے۔ اقلیم سخن کا ابدالی، اردو ادب کا ماؤزے تنگ، مرد آہن، عابد شب بیدار، نواز کاوش میٹھا سر، جمال ادب، ظہور نظر ملحد، پیکر محنت، نوشی گیلانی چھوٹی بحر بڑی غزل، سدا بہار، دشت صحافت کا مسافر، سعید احمد خود ساز، روہی کا مجذوب فضل حمید، منڈا پیر ڈاکٹر فرحت عباس، مقتول قاتل، سبز رتوں کا پیامبر، وغیرہ۔

مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر اس کے خاکوں کے کچھ اقتباسات نذر قارئین ہیں۔
اقلیم سخن کا ابدالی میں رقم طراز ہے کہ ''دراز قد۔ متناسب اعضاء، تیکھے نقوش، ذہانت کی آئینہ دار روشن آنکھیں...... تیکھی ناک جو موصوف کے تیکھے ہونے کے علاوہ ''ناک والا'' ہونے کی علامت بھی ہے۔ اردو کی وی آئی پی شخصیت واجب التسلیم اور قابل احترام احمد ندیم قاسمی کی ہے...... قاسمی ہیں ابدالی نہیں مگر اقلیم سخن کے احمد شاہ ابدالی ہی ہیں...... ناصر حسنی دوسرے کے کندھے پر رکھ کر بھی بندوق چلاتا ہے۔ اسی خاکہ میں دیکھئے! ایک ناقد نما شاعر کا کہنا ہے کہ قاسمی پاکستان کا وہ واحد شاعر ہے، جو جھوٹ بولتا ہے، حالانکہ مشاہدے اور مطالعے کے مطابق شاعر بات کا بتنگڑ بنانے کے ماہر ہوتے ہیں۔ اس سے بڑا جھوٹ اور کیا ہوگا کہ ان کی محبوبہ بغیر کمر کے ہوتی ہے۔ ہمارے خیال میں قاسمی نے حسنی کیلئے کہا تھا، ریت سے بت نہ بنا میرے اچھے فنکار'' انہیں پتہ نہیں تھا کہ یہ فنکار ان کا لفظوں سے بت بنائے گا۔ وہ پتھروں کے بجائے اپنے طرز بیاں سے اس میں

رنگ بھی بھرے گا۔

اس کی ایک اور شخصیت ہے۔ پیر آف ماڑی قاسم شاہ (پیکر محنت) ''نرم مزاجی، نرم خوئی اور شائستگی کی ترتیب جب سانچے میں ڈھلتی ہے تو تابش الوری جیسے افراد وجود میں آتے ہیں..........آئینے سے عشق انسان کی کمزوری ہے۔مگر تابش الوری اپنی آواز کے سحر میں مبتلا ہیں محو گفتگو ہوتے ہیں تو ان کے ہاتھوں کی حرکات وسکنات قابل دید ہوتی ہیں۔ ہاتھ اور زبان کی سنگت سے ایسا سنگیت پیدا کرتے ہیں کہ سماعتیں معدوم اور آنکھیں پتھرا جاتی ہیں۔حاسدین کا کہنا ہے کہ گنگا کہیں بھی بہہ رہی ہو حضرت ہاتھ دھونے سے باز نہیں رہتے۔''

اس کی فقرے بازی اکثر اس کیلئے وبال جان بن جاتی ہے لیکن وہ لفظوں کی کاری گری میں ماہر ہے اس لئے پکڑ سے بچ جاتا ہے۔اپنے فقرے کے جواز میں وہ کبھی لغت کا سہارا لیتا ہے اور کبھی ادبی سند دے کر اپنے ناقدین کو خاموش کرا دیتا ہے۔

اس کے خاکے نوشی گیلانی (چھوٹی بحر بڑی غزل) سے چند سطور دیکھئے: ''نوشی نے جونہی دشت غزل میں قدم رکھا اس کے پاؤں بوجھل ہو گئے مگر آ گا مارنے کی خاصیت نے اس کا پیچھا خاصہ بھاری کر دیا ہے۔ وہ کاغذ کی بساط پر لفظوں کے مہرے جمانے کا ہنر جانتی ہے مگر ابھی شاطرانہ چالوں سے زیادہ آگہی نہیں رکھتی'۔ ہماری رائے میں نوشی کا شخصیہ کسی دوست کا فرمائشی ہے۔اسے پڑھ کر مرزا رفیع الدین سودا یاد آ جاتے ہیں جہاں کسی کی بات طبع نازک پر گراں گزری تو اپنے ملازم خاص ''غنچہ'' کو آواز دے کر کہا لانا میرا قلمدان۔ ناصر حسنی میں پختون خون رواں دواں ہے۔اس لئے اس تحریر میں قلمی دوستی بھی خوبصورتی سے نبھائی ہے۔

ایک اور خاکے سدا بہار سے ایک سطر دیکھئے: ''نسب کے اعتبار سے قریشی ہے مگر جب سے یہ بات اس کے علم میں آئی ہے کہ ابوجہل بھی قریشی تھا۔اس نے اپنے نام کے ساتھ قریشی لکھنا چھوڑ دیا ہے۔''

مقتول قاتل!!! منور جمیل کا شخصیہ ہے اس میں ناصر حسنی کا خاکہ نگاری کا نظریہ واضح

ہو جاتا ہے۔اس کے مطابق ''خاکہ نگاری میں شرارت نگاری کا عنصر نہ ہوتو خاکہ لکھنے اور خاک اڑانے میں کوئی فرق نہیں رہتا۔''

شگوفہ بازی اس کی تحریروں کا خاصہ ہے۔سعید احمد خودساز میں لکھتا ہے''سعید احمد کو خاک سے بہت ڈر لگتا ہے بار بار کہہ چکا ہے کہ میرا خاکہ لکھوتو خاک مت اڑانا۔''

ہم نے دیکھا کہ وہ طنز کا نشتر لگاتا ہےتو، پھرتی سے اس پر مزاح کا لیپ بھی کر دیتا ہے۔قاری اس کی زبان اور طرز بیان سے بھی لطف اندوز ہوتا ہے۔بات کو سمیٹتے ہوئے اتنا کہنا ہے کہ اس نے شخصی خاکوں کو ادب کے نئے سانچوں میں ڈھالا ہے۔یہ درست ہے کہ سچ لکھنا ہی مشکل نہیں بلکہ سچ سننا اس سے بھی زیادہ مشکل ہے۔کرسچن اینڈرسن کی مشہور کہانی ''بادشاہ ننگا'' میں ایک بچے کی سچائی سارے جلوس کے شرکا کی آنکھیں کھول دیتی ہے۔اسی طرح ناصر حسنی کے پین پوٹریٹ کے بہت سے فقرے تساؤ کے بتوں کی طرح خاموش نہیں رہتے بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ حقائق کے بند دروازوں کی زنجیریں بھی ہلا رہے ہیں۔اس نے ادب کے گلدان میں بہت سے خاکے سجا دیئے ہیں اب اس کا کہنا ہے کہ:

اب تم سوچو اب تم جانو جو چاہو اب رنگ بھرو
ہم نے تو اک نقشہ کھینچا اک خاکہ تیار کیا

اقلیم سخن کا ابدالی

احمد ندیم قاسمی خاکہ

جدراز قامت، متناسب اعضاء، تیکھے نقش ونگار، ذہانت کی آئینہ دار روشن آنکھیں، کشادہ پیشانی، سر پر بالوں کا گھنا جنگل جو اُن کے لہو کے درجہ کھولاؤ کو معتدل رکھتا ہے۔ تیکھی ناک جو موصوف کے تیکھے ہونے کے علاوہ ''ناک والا'' ہونے کی علامت بھی ہے۔ چہرے پر ایک لمبا سا نشان جو خط مستقیم کی طرح ایستادہ ہے جسے ان کے مخالفین ان کے جھگڑالو اور فسادی ہونے کی دلیل قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ وہ لوح وقلم کے آدمی ہیں۔ توپ وتفنگ سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔

جی ہاں! آپ کا خیال سوفی صد درست ہے یہ خاکہ، یہ لفظی پیکر، لفظوں کی یہ کھنک اردو کی وی آئی پی شخصیت، واجب التسلیم اور قابل احترام جناب احمد ندیم قاسمی کی ہے۔ قلمی نام احمد ندیم قاسمی ہے۔ خاندانی نام احمد شاہ ہے، قاسمی ہیں ابدالی نہیں مگر اقلیم سخن کے احمد شاہ ابدالی ہی ہیں۔ ان کے والد محترم معلومہ تاریخ کے پہلے پیرزادہ ہیں۔ جو نذر ونیاز کے طفیل محل مینارے نہ بنا سکے۔ حالانکہ وطن عزیز میں اسمبلی ہاؤس بھی پیرزادہ ہاؤس ہی سمجھے جاتے ہیں۔ جنہیں بعض ستم گر ہاؤس اینڈ کیٹل ہاؤس بھی کہتے ہیں۔ قاسمی صاحب کا بچپن غربت کی گود میں گزرا۔ بالائے ستم یہ کہ کم عمری میں والد محترم کے مشفق سائے سے محروم ہو گئے۔ سوان کا لڑکپن مرے کو مارے شاہ کی تصویر بن گیا۔ اللہ میاں نے ان کو ایک خاص مقصد کے تحت عالم نور سے عالم رنگ بو میں وارد کیا تھا۔ اس لئے اپنی تمام مشکلات پر قابو پاتے رہے۔ عملی زندگی کی ابتداء کلرکی سے کی مگر کلرک بادشاہ نہ بن سکے۔ آج ''فنون'' کے سائبان تلے لمبی تان کر سو رہے ہیں۔ صحافت میں بھی خوب نام کمایا۔ لوگ علم حاصل کرنے چین جاتے ہیں یہ اپنے علم کے زور پر چین گئے۔ وہاں کے لوگوں کو ان کی شاعری اور داستان طرازی اتنی بھائی کہ وہ موصوف کو اپنا بھائی سمجھنے لگے اور ان کی تخلیقات کو چینی زبان کے قالب میں ڈھال کر اپنی برادری میں شامل کر لیا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ کمال ان کی شاعری کا ہے۔ نہ افسانہ نگاری بلکہ یہ تو ان کی صحافت کا کرشمہ ہے۔ ان کے اثر ورسوخ کا معجزہ ہے۔ عمر

کے حوالے سے اس دور کے سب سے سینئر ادیب، شاعر اور صحافی ہیں اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہیں۔اس اعتبار سے انہیں ساٹھا پاٹھا کہا جا سکتا ہے۔جن لوگوں میں حسد کا مادہ ضرورت سے زیادہ ہوتا ہے۔ وہ انہیں ''سٹھیایا'' کہتے ہیں۔ ادبی حوالے سے ایک مکتبہ فکر کی حیثیت رکھتے ہیں وہ ایک ایسا مدرسہ ہیں جس کے دروازے غیر ملکیوں کے لئے بھی کھلے رہتے ہیں۔اسی لئے کچھ لوگ انہیں امریکی صدر بش کی نظر سے دیکھتے ہیں۔قاسمی صاحب ایک باکمال فن کار ہی نہیں باکمال انسان بھی ہیں۔ترقی پسندوں میں ترقی پسند اور اسلام پسندوں میں اسلام پسند ہیں۔یہی وجہ ہے کہ سیکولر ذہن رکھنے والے ان کی مذہبیت اور پاکستانیت پر حملہ آور ہو کر اپنے آپ کو لبرل ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔مگر ان کا لبرل ہونا جنرل پرویز مشرف کی آزاد خیالی کی حد سے آگے نہیں بڑھتا۔ایک نامور ناقد کے خیال میں قاسمی صاحب ہبت اچھے شاعر ہیں۔ باکمال افسانہ نگار ہیں، نامور کالم نویس ہیں مگر ان کے ہاں ہمیشہ تھوڑی سی کسر رہ جاتی ہے۔ ہمارا مشورہ ہے کہ وہ حضرت اس تھوڑی سی کسر کی تلاش میں سرگرداں نہ ہوں کیونکہ یہ تھوڑی سی کسر ایک آنچ کی کسر ہے جو شاعر اور مفکر کے ہاں نہ پائی جائے تو وہ پیمبر بن جائے۔ ایک ناقد نما شاعر کا کہنا ہے کہ قاسمی (صاحب) پاکستان کا واحد شاعر ہے جو جھوٹ بولتا ہے۔حالانکہ مشاہدے اور مطالعے کے مطابق شاعر بات کا بتنگڑ بنانے کے ماہر ہوتے ہیں۔اس سے بڑا جھوٹ اور کیا ہوگا کہ ان کی محبوبہ بغیر کمر کے ہوتی ہے۔اگر شاعر متضاد باتیں نہ کریں تو صاحب کشف کہلائیں۔

کچھ عرصہ قبل اکادمی ادبیات پاکستان کی جانب سے عالمی ادبی کانفرنس کا انعقاد کیا گیا تھا جہاں احمد ندیم قاسمی صاحب نے اردو مقالہ پڑھ کر بہت سے اردو کے ادیبوں کا منہ کالا کر دیا تھا اور سونے پر سہاگہ یہ کہ روسی مندوب نے اردو میں مقالہ سنا کر بہت سے پاکستانی ادیبوں کو عرق ندامت میں غرق کر دیا تھا۔شنید ہے کہ اس معاملے میں بھی قاسمی صاحب کی ابدالیت کا عمل دخل ہے۔ کیونکہ روسی ادیبہ لڈ بیلا کا اردو ادب سے لگاؤ قاسمی صاحب کی تخلیقات کے باعث ہے۔

اُردو اَدب کا ماؤزے تنگ

خاکہ: وزیر آغا

ناصر حسنی

گندمی جسم، سنہری رنگت، مناسب قد و قامت، نکھرا نکھرا چہرہ، روشن چمک دار آنکھیں، ہنسیں تو آنکھیں مسکرائیں، بولیں تو لب مکالمہ کریں سر پر چائنا کیپ، یہ سراپا ہے اردو کے مایہ ناز ادیب، شاعر، نقاد انشائیہ، نگار واجب الاحترام جناب وزیر آغا کا ہے اگر موصوف کی آنکھیں چندھیائی ہوئی ہوتیں تو دیکھنے والے ان کو چین کے مایہ ناز سپوت ماؤزے تنگ کی کاربن کاپی سمجھتے، ویسے سمجھنے والے تو ان کو انشائیے کا بانی بھی سمجھتے ہیں اور جو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے، ان کو اردو ادب کا ستون قرار دیتے ہیں تبھی تو اس ستون کو گرا کر اپنی بنیاد بچانا چاہتے ہیں حالاں آنکہ ستون گر جاتے تو بنیاد ملبے کے نیچے دب جاتی ہے، کسی خیر خواہ نے آغا جی سے پوچھا ''آپ نے ساقی فاروقی کا مضمون ''نابالغ شاعری کی ایک مثال'' پڑھا۔ وہ مضمون تو نابالغوں کیلئے لکھا گیا ہے اور جہاں تک ساقی کا تعلق ہے تو وہ ساقی گری کے اس مقام پر ہے جہاں ابلاغ کی ضرورت ہی نہیں رہتی''۔

مسٹر خردشیف نے ایک ملاقات کے دوران ماؤزے تنگ سے کہا ''تم ایک جاگیر ہو اور میں ایک غریب آدمی ہوں اس کے باوجود موجودہ منصب تک پہنچ گیا ہوں۔'' یہ سن کر ماؤزے تنگ نے کہا اس کی وجہ میری جاگیرداری اور تمہارے لیے عوامی ہمدردی نہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہم دونوں نے اپنے اپنے طبقوں کو دھوکا دیا ہے'' آغا جی! ماؤزے تنگ سے کس حد تک ذہنی مطابقت رکھتے ہیں ہم اس کا فیصلہ نہیں کر سکتے کہ حد ادب مانع ہے اور حدوں کی خلاف ورزی پر پولیس ہی نہیں رینجرز بھی گرفت میں رکھنے کا حق رکھتی ہے۔

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ہمارے ہاں بہت سے ڈاکٹر ایسے بھی ہیں جو صحت مند لفظوں کو بھی بیمار کر دیتے ہیں مگر یہ بات ایسی انہونی بھی نہیں جس کا بتنگڑ بنا لیا جائے بندوں کے بعض ڈاکٹر اپنے مریضوں کو دائمی مریض بنا دیتے ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا اردو ادب کی انتہائی اہمیت کی حامل شخصیت ہیں۔ تنقید اور انشائیہ نگاری میں

نمایاں مقام کے مالک ہیں ویسے یہ مالک تو ان لوگوں کے دل ودماغ کے بھی ہیں جو عوام کے قلب ونظر کو متاثر کرتے ہیں گریجوایشن کے بعد معاشیات میں ایم اے کیا تاکہ قوم کی معاشی حالت کو سنوار سکیں مگر معاشیات کی شعبدے بازی اور اعداد وشمار کے گورکھ دھندے سے اکتا کر کسی دوسرے دھندے کے بارے میں سوچنے لگے آخر کار اردو ادب میں پی ایچ ڈی کیا اور ادب کے ڈاکٹر بن گئے مگر اردو ادب کی حالت بھی ملکی معیشت سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی اس لیے ''اوراق'' کے ذریعے ادب کی حالت اور اس کی لوح تحریر بدلنے کا تہیہ کر بیٹھے۔

انشائیوں کے دو چار مجموعے چھپوا کر اتنے معتبر بن گئے کہ ہر ادیب سے آنکھیں چار کر سکیں مگر دس بارہ شعری مجموعی منظر عام پر لا کر بھی خود کو آدھا شاعر ہی منوا سکے کیونکہ ان کے مخالفین ان کے ساتھ وہی سلوک کرتے ہیں جو پولیس والے کسی شریف شہری سے کرتے ہیں۔ پولیس کا ہدف بننے کیلئے دس نمبری ہونا ضروری نہیں۔

محترم وزیر آغا کے حامی ان کو انشائیے کا بانی کا قرار دیتے ہیں مگر اس ''قول وقرار'' کو بھی ان کے مخالفین محبت کرنے والوں کے درمیان ہونے والا ''قول قرار'' قرار دیتے ہیں۔ اس کے باوجود یہ بات تسلیم شدہ نہ سہی طے شدہ ہے کہ وزیر آغا نے انشائیے کو مقبول عام بنانے میں بہت نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

مدتوں پہلے اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کے زیر اہتمام ''انشائیہ سیمینار'' کا انعقاد کیا گیا تھا، ہم نے محترم خورشید ناظر سے کہا کہ یہ اہل بہاول پور کے ساتھ زیادتی ہے کیونکہ بہاول پور کا افتخار انشائیہ نہیں افسانچہ ہے۔ جواباً خورشید ناظر نے کہا تھا کہ عزیزم! دعا کرو کہ کوئی وزیر بھی افسانچہ لکھنے لگے ان کی تائید وحمایت کے بغیر کوئی افسانچہ نگار خود کو نہیں منوا سکتا مگر تمہیں بددل ہونے کی ضرورت نہیں ایک وقت آئے گا جب افسانچے پر تھیسز لکھے جائیں گے اور تمہارا شمار افسانچہ کے بانیوں میں ہوگا اور پھر ہمیں اس کا تجربہ بھی ہوگیا۔

ہمارے عزیز دوست ظہور آثم کی غزل ''اوراق'' میں چھپی تو اس نے ایک اور غزل بھی بھیج دی جس کی پسندیدگی اور بہار نمبر میں شامل اشاعت ہونے کی نوید بھی مل گئی اس خوشی میں اس نے ہمیں بھی شامل کرنے کیلئے ہمارے چند افسانچے ''اوراق'' کو ارسال کر دیے کچھ دنوں بعد افسانچے اس تبصرے کے

ساتھ واپس کر دیئے گئے کہ افسانچہ چھاپنا ہماری روایت نہیں ہم نے اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا اب ''اوراق'' تمہارے لئے شجر ممنوعہ قرار دیا جا چکا ہے ہمارے تبصرے کو اس نے شاعرانہ تعلّی سمجھا مگر جب بہار نمبر میں اس کی غزل نہ چھپی تو اس نے پوچھا وزیر آغا سے تمہاری اتنی ذہنی ہم آہنگی کیسے ہوگئی؟ بعض سوال لاجواب ہوتے ہیں اور اس سوال کا شمار بھی ایسے ہی لاجواب سوالوں میں ہوتا ہے، سو جواب دینے کے باوجود ہم لاجواب ہو گئے کہ خود کو لاجواب بنانے کا یہ بہت آسان طریقہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب تنقید و تحقیق پر 13 کتابیں تحریر کر چکے ہیں اور یہ کتابیں بہت سے شاعروں، افسانہ نگاروں، انشائیہ نگاروں، حتیٰ کہ بہت سے تنقید نگاروں کو تیرہ تین کر چکی ہیں۔ آغا جی! دوسروں کی تحریروں سے بہت کم مطمئن ہوتے ہیں اور کبھی کبھی تو ان کا اپنا لکھا ہوا بھی طمانیت کا احساس بےدار نہیں کر سکتا، شاید موصوف دنیا کے واحد شخص ہیں جو اپنی لکھی ہوئی سوانح عمری سے بھی مطمئن نہیں یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی سوانح عمری دوسری بار نظم میں تحریر کی ہے۔ ان کی پہلی سوانح عمری کا عنوان ''شام کی منڈیر سے'' ہے ڈاکٹر نے دوسری بار اپنی داستان حیات کو ''آدھی صدی کے بعد'' کے عنوان سے نظم کیا ہے۔ شنید ہے تیسری بار وہ اپنی زندگی کے نشیب و فراز کو نثری نظم میں قلم بند کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں غالباً اس کا نام تو اس کی منڈیر سے ہوگا، بعض دوستوں کا خیال ہے کہ وہ تیسری بار اپنی روداد حیات کو ہائی کو یا ثلاثہ میں تحریر کریں گے۔

ہمارے ہاں جو سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں ان کا تعلق خود انکشافی سے زیادہ خود نمائی سے ہوتا ہے، جبکہ آغا جی! نے اپنی سوانح عمری میں اپنے باطن کو عیاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ آغا جی! کے بعض بدطینیت نقاد سرقے کا الزام بھی لگاتے ہیں جو سراسر غلط ہے کیونکہ اس طرح تو ہر تحقیق اور مقالمہ نگار مسروق قرار پائے گا کہ ادھر ادھر کے مال پر ہاتھ صاف کیے بغیر نہ تو تحقیق ہو سکتی ہے اور نہ ہی مقالمہ مکمل ہو سکتا ہے۔ علاوہ ازیں تنقید کی ضروریات بھی نامکمل رہیں گی ہمارے خیال میں آغا جی! سے ادیبوں کی ناراضگی کی بڑی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ایک بار انہوں نے کہا تھا کہ ہمارے اکثر شاعر و ادیب دولت سمیٹنے، شہرت کمانے، میڈیا پر قبضہ جمانے اور اپنے ادبی مخالفین سے انتقام لینے کے سوا کوئی اور کارنامہ سرانجام نہیں دے سکے۔ جمہوریت ہو یا مارشل رجیم یہ لوگ حکمرانوں کے در پر سیس نوارتے ہیں۔

وزیر ہمیشہ باتدبیر ہوتا ہے مگر یہ پہلے وزیر ہیں جو آغا بھی ہیں اور جہاں تک ان کے باتدبیر ہونے کا تعلق ہے تو اس کا اندازہ اس روایت سے لگایا جا سکتا ہے کہ وزیر آغا بھارت یاترا کا زادِ راہ جیب

میں لیے پھرتے ہیں، دروغ برگردن راوی۔

آغا جی! بہت باکمال آدمی ہیں، ان کے ناقد آج تک یہ فیصلہ نہیں کر پائے کہ موصوف ادیب زیادہ اچھے ہیں یا تنقید نگار بہتر ہیں ہمارے خیال میں وہ اقلیم سخن کے بادشاہ ہیں بلکہ بادشاہ گر بھی ہیں، بہاول پور کے ممتاز شاعر اور معروف نقاد خورشید ناظر کی تحقیق کے مطابق وزیر آغا کی بادشاہت کا نسب نامہ ایسے بادشاہوں سے ملتا ہے جن کے پوتوں کا اقلیم سخن میں کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ آغا جی! نام ہی کے بادشاہ نہیں، عادات واطوار بھی بادشاہوں جیسے رکھتے ہیں بادشاہ لوگوں کی طرح یہ بھی ہر سال پھلوں کی پیتیاں دوستوں کو بھیجتے ہیں ان کے باغ کے سنگترے برصغیر کے ہر اس گوشے میں بگو گوشے کی طرح مزے لے لے کر کھائے جاتے ہیں جہاں انشائیہ نگار پائے جاتے ہیں ہمارے خیال میں سنگترے کو پھلوں کا انشائیہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا جو کیفیات انشائیہ پڑھتے وقت قاری پر طاری ہوتی ہے وہی کیفیت سنگترہ کھاتے وقت خواتین خصوصاً کم سن خواتین پر طاری ہو جاتی ہیں۔

مرد آہن

خاکہ

انور سدید

اگلے وقتوں میں عالم اپنی کتابیں اونٹوں پر لاد کر پھرا کرتے تھے۔ ڈاکٹر انور سدید اگلے وقتوں کے عالم ہیں نہ جدید دور کے سیاح ہیں۔ اردو ادب کے ڈاکٹر ہیں۔ موصوف کی کتابوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے جو اونٹ پر لادی جا سکتی ہیں۔ بظاہر بڑے ملنسار اور خوش اخلاق ہیں مگر بہ باطن اول ''خویش بعد درویش'' کے قائل ہیں۔ انسان خواہ کتنی ہی ترقی کر لے مگر اپنی حیوانی جبلت سے نجات نہیں پا سکتا۔ ڈاکٹر صاحب میں یہ جبلت کچھ زیادہ ہی ہے کسی بھی صورت میں اپنی برادری سے باہر نہیں نکل سکتے۔ شاید اسی وجہ سے انور سدید کے بجائے انور شدید کی حیثیت سے زیادہ معروف ہیں۔ توپ وتفنگ سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے مگر بعض لوگوں کے لئے توپ ہی ثابت ہوتے ہیں۔ شاعری کرتے ہیں، افسانے سناتے ہیں۔ انشائیے لکھتے ہیں۔ شاعروں اور افسانہ نگاروں کے بخئے ادھیڑنے میں خاص مہارت رکھتے ہیں۔ بس شرط یہ ہے کہ وہ ''اُدھر'' کے لوگ ہوں۔ اپنا لکھا ہو، اپنے مرشد کا فرمایا ہوا اور مرید بھائیوں کا تحریر کیا ہوا ہی مستند گردانتے ہیں۔ کہتے ہیں لکھنے کا ہنر ہمارے قبیلے کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ یہ جس پر لکھ دیں وہی باوقار ہے جس پر کسی اور نے لکھا، وہ بے وقار ہوا۔ اردو ادب پر ان کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ انہوں نے وزیر آغا دیا اور وزیر آغا کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے انور سدید کو انور شدید بنایا۔

فلمی دنیا میں تو بہت سی جوڑیاں ہیں جو بنتی رہتی ہیں مگر قلمی دنیا کی غالباً یہ واحد جوڑی ہے جو ان بریک ایبل ہی نہیں خراش سے بھی محفوظ ہے۔ یاد آیا، بھلے وقتوں میں ایک قلمی جوڑی بہاول پور میں بھی ہوا کرتی تھی اور یہ جوڑی تھی منور جمیل قریشی اور نوشی گیلانی کی۔ جمیل بھائی! نے گارڈ فادر بننے کی کوشش کی نوشی گیلانی نے شوہر ڈھونڈ لیا نوشی کو شادی راس نہ آئی۔ گارڈ فادر کے بعد اسے

شوہر سے بھی ہاتھ دھونا پڑے لیکن سر سلامت ہو تو گھونگھٹوں اور سہروں کی کمی نہیں ہوتی ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔ بندہ صحرائی کے بعد نوشی گیلانی بندۂ کوہستانی کی پناہ میں ہے۔ خدا اپنی امان میں رکھے۔ فرقہ جمیلہ کی پیش گوئی کے مطابق کسی بھی وقت ''تڑک'' کی آواز آسکتی ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس وقت کے کمشنر بہاول پور برلاس مرتضیٰ جو نوشی گیلانی کے بزرگ بنے ہوئے تھے'' شاعروں میں شاعر اور افسروں میں افسر'' ہی رہنا پسند کرتے تھے اچانک بیوروکریٹ بن گئے۔ نقش گری کی اس بے قدری پر دریائے کوسی میں طوفان آ گیا۔ (مراد آباد اور رام پور کے قریب ایک دریا کا نام ہے) اور نوشی کے اس اقدام کو بغاوت سمجھ بیٹھے مگر مجبوری یہ تھی کہ نوشی گیلانی نے ایک پاکستانی نژاد امریکی سے شادی کی تھی اور امریکی مٹی کا بھی ہو تو ساس کی طرح برا ہوتا ہے۔ سو اظہار ناراضگی کے سوا کچھ نہ کر سکے مگر جمیل بھائی! کے اندر برپا ہونے والا طوفان بہت شدید تھا، انہوں نے نوشی گیلانی کو شاعر ماننے سے ہی انکار کر دیا اور اس کی شاعری کو اپنی شاعری قرار دے کر عدالت جا پہنچے لیکن عدالتی دھکے ذہنی دھچکے سے بھی زیادہ شدید تھے بلکہ انور شدید تھے۔

خدا جانے یہ کیا بھید ہے کہ ہم جب بھی جمیل بھائی کو دیکھتے ہیں ہمیں اداکار مصطفیٰ قریشی یاد آنے لگتا ہے۔ جب تک سلطان راہی زندہ رہا، مصطفیٰ قریشی کا طوطی بولتا رہا، جوں ہی سلطان راہی، راہی ملک عدم ہوا، مصطفیٰ قریشی کا دل فلمی دنیا سے اچاٹ ہو گیا۔ سنا ہے، جمیل بھائی، نوشی پروف ہو چکے ہیں اور اس کی شاعری بھی ہضم ہونے لگی ہے۔ خبر تو خوش آئند ہے۔ خدا کرے یہ افواہ نہ ہو۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انور سدید نے لاشعوری طور پر وزیر آغا کے باڈی گارڈ کی ڈیوٹی سنبھالی ہوئی ہے اور ان کو تنقیدی یلغار سے اس طرح محفوظ رکھا ہے جیسے مرغی چیل کے سفاک پنجوں سے چوزے کو بچا کر رکھتی ہے۔ جب کہ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اپنے اس روپ میں دراصل انہوں نے اپنی ہی حفاظت کی ہے اور وزیر آغا کو ڈھال کے طور پر استعمال کیا ہے۔ بہرحال سچ کیا ہے؟ اس کا فیصلہ تو آنے والا وقت ہی کرے گا کہ سب سے بڑا منصف وقت ہی ہے۔

معاصر ادب کا تعلق دنیا کے کسی بھی خطے سے ہو ڈاکٹر صاحب اس سے باخبر رہتے ہیں اس باخبری کے دو فائدے ہیں۔ پہلا فائدہ تو یہ ہے کہ موصوف ایسے تمام ادیبوں سے باخبر رہتے ہیں جو نقب زنی کے ماہر ہوتے ہیں، چوری اور سینہ زوری جن کا شیوہ ہوتا ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ مطالعہ کی وسعت نے ان کو سمندر جیسی گہرائی عطا کی ہے اور معاصرین کی حیثیت دریا بن کر رہ گئی ہے۔ بات سننے کا حوصلہ رکھتے ہیں اور بات کرنے کا سلیقہ بھی جانتے ہیں بات کیسی بھی کڑوی کسیلی ہو حلق سے نیچے ضرور اتار لیتے ہیں۔ اب یہ ایک الگ بات ہے کہ اس کا ردعمل دوسروں پر ہوتا ہے بین السطور بات کرنا لاکھ ہنر سہی مگر محتاط روی کی دلیل ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا سرجری سے کوئی علاقہ نہیں بس مزاجاً جنگ جو واقع ہوئے ہیں اس لئے پوسٹ مارٹم کرنا ان کا من پسند مشغلہ ہے۔ آتش مزاجی کا یہ عالم ہے کہ ان کا شمار اردو ادب کے کھوٹہ پلانٹ میں ہوتا ہے یہ قرب و جوار کو اپنا مطیع اور معتقد بنانے کے لئے مختلف علاقوں میں کھوٹہ پلانٹ لگائے ہوئے ہیں جو ان کے ماہر دستکار ہونے کے علاوہ ان کی سپاہانہ اہلیت کا ثبوت ہیں ان کے ایک ہاتھ میں قلم دوسرے میں تلوار اور تیسرے ہاتھ میں، جو باطنی ہے بالکل بدھ لاماؤں کی تیسری آنکھ کی طرح اس میں ہتھوڑا ہے۔ شنید ہے بعض کمزور دل حضرات اس کے تصور ہی سے دہشت زدہ ہو جاتے ہیں۔

من حیث القوم ہم بڑے دلچسپ واقع ہوئے ہیں۔ قانون کی پابندی ہماری طبع حساس پر گراں گزرتی ہے مگر مکتب عشق کے دستور پر بڑی باقاعدگی سے عمل کرتے ہیں۔ پاکستان کے سب سے معروف مکتب عشق پنجاب یونیورسٹی سے انہوں نے ایم اے کیا۔ سبق سارا ہی یاد کر لیا تھا سو گولڈ میڈل کے حقدار ٹھہرے مگر ایک کالی بھیڑ ان کا گولڈ میڈل گول کرنا چاہتی تھی۔ کالی بھیڑیں کالے کوٹوں میں ہی نہیں، سفید شیروانیوں میں بھی ہوتی ہیں۔ ماں کی دعائیں ساتھ تھیں اس لئے ان کے گولڈ میڈل کو گول کرنے والے کا پلان گول ہو گیا۔ اہلیت کا جادو نہیں چلتا مگر جب چلتا ہے تو سمندر بھی پھلانگ جاتا ہے۔ سو، مکتب عشق کے اس طالب کو سبق یاد کرنے پر چھٹی تو نہ ملی، چھٹی مل

گئی، گولڈ میڈل حاصل کرنے کی۔

آپ بیتی ''آپ'' سنائی جائے تو ''کلام شاعر بہ زبان شاعر'' کی طرح مزا دیتی ہے۔ ''چشم بیتی'' سنانے والوں کے بیان کو بعض اوقات عینک کی دیمک لگ جاتی ہے۔ گولڈ میڈل کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ ان کی آپ بیتی کا حصہ ہے۔ اصل قصہ کچھ یوں ہے کہ انہوں نے ایم اے کے پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے امتحان دیا تھا۔ اس لئے گولڈ میڈل دینے والوں کا خیال تھا کہ پرائیویٹ امیدوار کو گولڈ میڈل دیا گیا تو پنجاب یونیورسٹی کا تدریسی نظام اور تدریسی عملہ تنقید و تنقیص کا نشانہ بنے گا مگر ایک مردِ حق کا کہنا تھا کہ حقدار کو حق دینا ہی مردِ رشید کا شیوہ ہے اور استاد کا طریق ہی رشد و ہدایت ہے۔

ملحد

خاکہ

ظہور نظر

ناصر حسنی

بھارت کے ذرائع ابلاغ سے ظہور نظر کی ادبی خدمات اور ان کی شاعرانہ عظمت کو خراج تحسین پیش کیا جا رہا تھا، ادھر ٹیکنیکل ہائی سکول بہاولپور میں ظہور نظر کی میت نماز جنازہ کی منتظر تھی۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ ظہور نظر قادیانی تھا، اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھائی جاسکتی۔ بڑی کرب ناک اور تکلیف دہ صورت حال تھی۔ ظہور نظر زندہ تھے تو بہاول پور کا ہر شخص ماما کہتا تھا مگر آج کوئی بھانجا نماز جنازہ پڑھنے کیلئے تیار نہ تھا۔ ظہور نظر کہا کرتے تھے کہ:

خلقت شہر نہ مانی میرا ملحدہ ہونا

ورنہ شوشے تو بہت مفتی دین نے چھوڑے

مگر مرنے کے بعد ان کے ملحدہ ہونے کے شوشے خلقت شہر نے چھوڑے اور ان کو مفتی دیں نے مسلمان قرار دے کر نماز جنازہ پڑھائی بعض لوگوں کو عزت اور شہرت حصہ بقدر جبشہ کے مطابق ملتی ہے۔ عبدالحمید عدم اور ظہور نظر کا شمار ایسے ہی افراد میں ہوتا ہے۔ ظہور نظر کا بچپن بڑی کسمپرسی میں گزرا۔ کہتے ہیں آدمی کی شکل وصورت پر مت جاؤ کہ اس کے قد وقامت اور نقش ونگار ایسے بازی گر ہیں جو کھلا دھوکا دیتے ہیں۔ ظہور نظر شکل وصورت سے پہلوان نظر آتے تھے مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ اقلیم شعر وسخن کے رستم زماں تھے۔ سنا ہے کہ علامہ اقبالؒ نے جب تک شکوہ جواب شکوہ نہیں لکھا تھا لوگ انہیں پہلوان سمجھتے تھے۔ بھئی! ناراض مت ہو۔ ہم ظہور نظر اور علامہ اقبال کا تقابلی جائزہ لینے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ ہم جانتے ہیں کہ اقبال، اقبال تھے اور ظہور نظر ظہور نظر ہیں۔ اہل بہاول پور ظہور نظر کو پیار سے ماما کہا کرتے تھے اور وہ بھی اہل بہاول پور سے بہت پیار کیا کرتے تھے۔ منیر نیازی ہر مشاعرے میں اپنی یہ غزل

تم نے تو منیرا پنی عادت بنالی ہے
جس شہر میں رہنا اکتاتے ہوئے رہنا

اور ظہور نظر اپنی یہ غزل ضرور سنایا کرتے تھے:

خلقت شہر نہ مانی میرا ملحد ہونا
ورنہ شوشے تو بہت مفتی دیں نے چھوڑے

منیر نیازی اور ظہور نظر میں ایک قدر مشترک یہ تھی کہ دونوں اپنے شہر سے بہت پیار کیا کرتے تھے، کہتے ہیں حب الوطنی کی پہلی منزل اپنے شہر سے پیار کرنا ہے۔ جسے اپنے شہر سے پیار نہ ہو۔اس کی حب الوطنی مشکوک ہوتی ہے۔

رنگت ایسی سانولی سلونی جس کی چاہت میں گوریاں گوروں کو پرے دھکیل دیتی ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ہمہ وقت قتل و غارت گری کا سوچنے والا نغمہ گری کیسے کرنے لگا۔عزیز و اقارب کی بے رخی اچھے برے کے احساس سے عاری کر دیتی ہے کوئی ایسا قابل مذمت کام نہیں جو ظہور نظر نے ظہور کی حیثیت سے نہ کیا ہو۔ مار پیٹ، گالی گلوچ، راتوں کو گھر سے غائب رہنا اس کا معمول بن چکا تھا۔ ماں کے سوا کسی سے محبت نہیں تھی۔ ماں کی اشک بار آنکھیں دیکھ کر اچھا بچہ بننے کا وعدہ کرتا اور کوشش بھی کرتا مگر چند یوم سے زیادہ ان پر عمل نہیں کرتا تھا آوارہ گردی کرتے کرتے بابا فرید کی روہی بہاول پور میں آن بسا اور روہی نے اپنی کشادہ باہوں میں سمیٹ لیا۔فرید گیٹ جو اس وقت بیکانیری گیٹ کہلاتا تھا، کے اندر جدید طرز کا ہوٹل قائم کیا۔مگر گاہکوں سے زیادہ شاعر ڈیرا جمائے رکھتے۔ نتیجتاً قرض کے بوجھ نے ہوٹل کا بھٹا بٹھا دیا۔ معاشرتی رویے اور عزیز و اقارب کے سلوک نے ظہور نظر کو آتش فشاں بنا دیا تھا۔ایسا آتش فشاں جو کسی بھی وقت لاوا اگلنے لگتا مگر اس کے اندر چھپا ہوا شاعر آتش فشاں کو پھٹنے نہیں دیتا تھا۔شاعری تو بہاول پور آنے سے پہلے ہی شروع کر چکا تھا مگر اس کی شاعری بہاول پور میں خوب پھلی پھولی، ریڈیو بہاول پور کے قیام نے اس کے دن پھیر دیے۔ مختلف ادبی پروگراموں کے ساتھ ڈرامے بھی باقاعدگی سے

لکھے۔قسمت کی دیوی مہربان ہوئی۔وہ بھی لوگوں پر مہربان ہونے لگا۔شنید ہے منو بھائی سے اس کے تعلقات بہت اچھے تھے جہاں یہ دونوں ہوتے وہاں تیسرے کی گنجائش ہی نہ ہوتی یہ بھی سنا ہے۔ان کی خلائی زبان سے اکثر لوگ خائف رہا کرتے تھے بہاول پور میں ظہور نظر اور سید آل محمد کی جوڑی بھی بہت مشہور تھی۔ بہت زیادہ پی کر آپ سے باہر ہوجایا کرتے تھے اس کے باوجود اہل بہاول پوران سے بہت پیار کرتے تھے۔ظہور نظر کو بھی اس کا احساس تھا تبھی اس نے کہا تھا:

خلقت شہر نہ مانی میرا ملحد ہونا

ورنہ شوشے تو بہت مفتی دیں نے چھوڑے

یہ کیسا المیہ ہے کہ یہ کیسی بدنصیبی ہے کہ مرنے کے بعد اس کا جنازہ،نماز کا منتظر رہا مگر کوئی مولوی نماز جنازہ پڑھانے پر آمادہ نہ تھا۔اس کے خاندان کے کچھ لوگ قادیانی تھے،اسے بھی قادیانی سمجھ لیا گیا۔اس کے کچھ دوستوں اور عزیزوں نے اس کا نعتیہ کلام ایک دینی مدرسے کو پیش کیا جس کی روشنی میں اس کے مسلمان ہونے کا فتویٰ جاری ہوا۔رخت سفر تو تیار تھا،فوری طور پر سفر آخرت کیلئے روانہ کر دیا گیا۔اگر ظہور نظر کے بچپن سے لے کر اس کے لڑکپن تک کے کردار کا جائزہ لیں تو احساس ہوتا ہے کہ اس کے قول وفعل اور سوچ ملحدانہ تھی۔مگر ہم اسے ملحد نہیں کہہ سکتے کیونکہ وہ اپنی ماں سے بہت محبت کرتا تھا۔جو شخص ماں سے محبت کرتا ہو وہ ملحد نہیں ہوسکتا۔ماں، جو خدا کا ایک روپ ہے۔

نئی غزل کا پیمبر

خاکہ

ظفر اقبال

ناصر حسنی

اردو کے مایہ ناز شاعر ظفر اقبال پر خاکہ لکھنا چاہتا تھا مگر حیران ہوں کہ کیا لکھوں۔ کہاں سے آغاز کروں۔ یہ لکھنا مناسب نہیں کہ وہ دراز قامت ہیں۔ بہت سے لوگ دراز قامت ہوتے ہیں بلکہ ضرورت سے زیادہ ہی لحیم شحیم ہوتے ہیں یہ کہنا بھی اچھا نہیں لگتا کہ ان کی آنکھوں میں ایک مخصوص چمک پائی جاتی ہے جو قلب طور پر گرنے کیلئے بے چین رہتی ہے۔ ہر ذہین شخص کی آنکھوں میں مخصوص چمک پائی جاتی ہے یہ کہنے سے بھی بات نہیں بنتی کہ ظفر اقبال معروف کالم نگار ہیں کہ یہاں کالم نگاروں کا جمعہ بازار لگا ہوا ہے۔ یہ کہنا بھی ان کی شایان شان نہ ہوگا کہ وہ ایک نامور وکیل ہیں کہ یہاں وکلاء کی کوئی کمی نہیں۔ نعیم بخاری اور اعتزاز احسن بھی موجود ہیں اپنی موجودگی کا احساس دلاتے رہتے ہیں۔ تو پھر خاکے کی ابتدا اس طرح ہوسکتی ہے کہ ظفر اقبال پاک و ہند کے نامور دانشور ہیں ادب اور صحافت کا کوئی ایسا شعبہ نہیں جہاں ان کے جھنڈے نہ گڑے ہوں ان کی شخصیت بڑی ہمہ جہت اور پہلو دار ہے۔

ظفر اقبال بڑے فراخ دل اور زبردست ناقد ہیں۔ صاحب کتاب کی غلطیاں نہیں نکالتے۔ صاحب کتاب ہی کو نکال دیتے ہیں۔

بہت دور اندیش وکیل ہیں کاش! جج ہوتے تو وزیر اعظم میاں نواز شریف کا اقامہ نہیں نکالتے۔ اقامت گاہ سے نکال دیتے۔

بہت اچھے مہمان نواز ہیں جو ایک بار ان کا دال دلیا کھالے پراٹھے آملیٹ کو بھول جاتا ہے۔

اصناف ادب کے ماہرین کا کہنا ہے کہ اسکیچ اور خاکے کا تعلق ایک ہی گھرانے سے ہے

مگر سچ یہ بھی ہے کہ ایک ہی گھرانے سے تعلق رکھنے والوں کا مزاج مختلف ہوتا ہے اور یہی اختلاف ان کی انفرادیت کو برقرار رکھتا ہے۔ ناقدین کی نظر میں جو کام لکیریں اسکیچ کاری میں کرتی ہیں وہی کام خاکہ نگاری میں لفظوں کو ادا کرنا پڑتا ہے مگر حقیقتاً ایسا نہیں، اسکیچ اداروں کو مطلوب افراد کا بنایا جاتا ہے اور خاکہ محبوب افراد کا لکھا جاتا ہے اسکیچ کارنی کے ذریعے چہرے کے خدوخال اور اس کی ساخت کو نمایاں کیا جاتا ہے تاکہ مطلوب فرد کو شناخت کیا جاسکے۔ خاکہ نگاری میں کردار، ذہنی ساخت اور قابلیت کو واضح اور عیاں کیا جاتا ہے۔

ظفر اقبال کی کتاب ''آب رواں'' نے اردو ادب میں آب حیات کا درجہ حاصل کرلیا ہے مگر انہوں نے ''رطب ویابس'' لکھ کر اپنے ساتھ وہی سلوک کیا جو خضر نے سکندر کے ساتھ کیا تھا۔

فطرتاً بہادر آدمی ہیں مخالفین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسخر کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ لفظوں کے جادوگر ہیں ''رطب و یابس'' میں کچھ ایسے منتر بھی شامل کر دیے جنہوں نے اعتراض کرنے والوں کے منہ بند کر دیے تاکہ اندر والا باہر نہ نکل سکے۔ دیکھتے! کیا زود اثر منتر ہے۔

معترض کے منہ سے ہے کتا بندھا۔ اس لیے سننا پڑے گی عف عف

ایسے میں خاموش رہ کر عزت محفوظ رکھی جاسکتی تھی لوگوں نے اپنی عزت کو دائمی تحفظ دینے کیلئے ''رطب و یابس'' میں لفظوں کی درگت اور توڑ پھوڑ کو لسانی تشکیلات کا خوبصورت نام دے کر اپنا نام ظفر اقبال کی گڈ بک میں لکھوالیا۔

''رطب ویابس'' پر تبصرہ کرتے ہوئے بانو قدسیہ نے کہا تھا کہ ظفر اقبال کی شاعری لنڈے کے پرانے کوٹ کا خوبصورت بٹن ہے مگر بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ظفر اقبال نے اپنے خیالات کو لفظوں کا جو پیراہن دیا ہے، جو ہرگز لنڈے کا مال نہیں خالصتاً پنجابی مال ہے۔

حنیف رامے نے ''رطب ویابس'' کے بارے میں کہا تھا کہ ظفر اقبال نے اردوئے

معلیٰ کو کوٹھے سے اُتار کے بھرے بازار میں دھکیل دیا ہے۔ جواباً ظفر اقبال نے کہا تھا کہ رامے صاحب کے اندر جو کوٹھا آباد تھا، وہ باہر آ گیا ہے۔

قمر جمیل نے ''آب رواں'' کی شاعری کے بارے میں کہا تھا۔ اگر مذہب اجازت دیتا تو وہ ظفر اقبال کو نئی غزل کا جبرائیل کہتے سو انہوں نے ظفر اقبال کو نئی غزل کا پیمبر کہنے ہی میں عافیت جانی۔

جمالِ اَدب

خاکہ

ڈاکٹر نجیب جمال

ناصر حسنی

اگر ہم سے خواص کی فہرست مرتب کرنے کا کہا جائے تو ڈاکٹر نجیب جمال کا نام سر فہرست ہوگا یہ بھی ممکن ہے ہمیں کوئی اور نام ہی نہ ملے کیونکہ عوام اور خواص کی سوچ میں کوئی خاص فرق نہیں، سوائے رہن سہن اور بود و باش کے۔عوام ہوں یا خواص سبھی زیے کی تثلیث کے پجاری ہیں ان کی زندگی کا مقصد و محور، زن، زر اور زمین کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا مگر ڈاکٹر نجیب جمال کو یہ فو قیت حاصل ہے کہ ان کی زندگی کا مطلوب و مقصود تنقید تحقیق اور تدریس ہے، تین ''تے'' ان کیلئے بہت اہم ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ قول سنہری حرفوں سے لکھنے کے قابل ہے کہ۔ اردو منافقت کا تریاق ہے اردو سے محبت کرنے والا منافق نہیں ہوسکتا۔ان کی نظر میں ہماری پسماندگی کا ایک بڑا سبب اردو زبان کے ساتھ حکمرانوں کی منافقت ہے۔

ڈاکٹر نجیب جمال شاعر ہیں، ادیب ہیں، ناقد ہیں، مگر طور طریقے شاعرانہ ہیں نہ ادیبانہ، نہ شکل و صورت سے کھلاڑی لگتے ہیں، ان کے کھلاڑی ہونے سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا۔ لفظوں کے بہت بڑے کھلاڑی ہیں، شطرنج کے مہروں کی طرح لفظوں کو سوچ سمجھ کر استعمال کرتے ہیں۔

والدین بڑے چاؤ اور محبت سے اپنے بچوں کا نام رکھتے ہیں اور یہ توقع بھی رکھتے ہیں کہ بچے بڑے ہو کر ان کا نام روشن کریں گے اگر ان کا نام ڈبو بھی دیں تو اپنے نام ہی کی عزت رکھ ہیں لیں گے مگر عموماً ہوتا یہ ہے کہ شیر خان اور بہادر علی کتّے کو دیکھ کر راستہ ہی بدل لیتے ہیں۔ ڈاکٹر نجیب جمال کا شمار ایسے خوش نصیبوں میں ہوتا ہے جنہوں نے نہ صرف والدین کی توقع پوری کی بلکہ اپنے نام کا بھرم بھی رکھ لیا وہ اسم با مسمیٰ ہیں نجیب بھی ہیں اور با جمال بھی ہیں غالباً نجیب ان کا نام

ہےاور جمال ان کا تخلص ہے اب یہ ایک الگ بات ہے کہ تنقید، تحقیق اور تدریس سے ایسی نبھی کہ شا عری کو طلاق دینا پڑی۔

کھلتا چہرہ، کھلتی رنگت، قد و قامت ایسی کہ کوئی ناواقف دیکھے تو ادب کے ڈاکٹر کے بجائے اکھاڑے کا ڈاکٹر سمجھ بیٹھے۔

سنا ہے، شاعری اور کہانی لکھی نہیں جاتی خود کو لکھواتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب سائنس کے طالب علم تھے ادب نے ان کا انتخاب کرلیا اور انہوں نے ادب کو اوڑھنا بچھونا بنالیا۔ اب تک ایک درجن سے زیادہ کتب شائع ہو چکی ہیں۔ بہاول پور کے شعراء کے حوالے سے شش جہات مرتب کی اور شش جہات ہونے کی سند پائی۔

ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ تنقید غلطیاں پکڑنے کا نام ہے یہ ایک الگ بات ہے کہ اس پکڑ دھکڑ میں ایسے لوگ بھی آجاتے ہیں جو اپنے فرمان کو مستند سمجھتے ہیں اور غلطی کا اعتراف کرنے کے بجائے فرماتے ہیں کہ مکھی ہمیشہ گندی جگہ پر بیٹھی ہے انہیں یہ بات کون سمجھائے کہ گندگی پھیلا ؤ گے تو مکھیاں آئیں گی۔

ہماری نظر میں اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ تخلیق پر گفتگو کرتے ہیں تخلیق کار پہ نہیں۔ شاعر میٹرک پاس ہو یا پی ایچ ڈی انہیں اس سے کوئی غرض نہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی غالب شناسی کے سبھی قائل ہیں، مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ انہوں نے پی ایچ ڈی کا مقالہ غالب شکن یگانہ پر لکھا۔

ناقد کو مہذب ہونا چاہیے، تنقید کے دوران تہذیب کا دامن چھوڑ دیا جائے تو پھر ناقد چھوڑنے لگتا ہے۔ ڈاکٹر چھوڑتے نہیں۔۔۔۔۔۔ پکڑتے ہیں غلطیاں۔

پلیٹ خالی ہو تو معدے سے زیادہ دماغ کو تکلیف ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب اپنا پیٹ کبھی خالی نہیں رکھتے اس سے ذہن بیدار رہتا ہے۔ صحت بھی قابل رشک رہتی ہے۔

ملازمت کے سلسلے میں دوسرے شہروں میں آباد ہونے والے عموماً ناسلٹجیا اور ہوم سک

نیکس میں مبتلا ہو جاتے ہیں مگر فیصل آباد سے بہاول پور آنے والے ڈاکٹر نجیب جمال کو ایسا کوئی عارضہ، کوئی مسئلہ نہیں، سواہل بہاول پور کیلیئے ان کا دم باعث صد افتخار ہے، باعث اعزاز ہے۔

منزل مراد کا راہی

خاکہ

سید تابش الوری

ناصر حسنی

روشن چمک دار آنکھیں، کشادہ پیشانی، کمان سی بھنویں جو بے لچک ہونے کی وجہ سے تیر چلانے کی اہلیت سے نا آشنا ہیں۔ ذی وقار لہجہ، باوقار گفتگو، موضوع سیاسی ہو، سماجی ہو، مذہبی ہو یا تاریخی بولتے ہیں تو فکر و تخیل کے سمندر میں چاند کے جلال و جمال کے بغیر ہی جوار بھاٹے کا گمان ہونے لگتا ہے۔

صاف ستھرا لباس، ستھری رنگت، زندگی کی پچ پر نصف سنچری بنا چکے ہیں اگر کوئی ناگہانی نہ ہوتی تو سنچری مکمل ہوسکتی ہے۔ عمر رسیدہ ہونے کے باوجود جوانوں سے زیادہ چاق چوبند۔ قیام پاکستان کے بعد اہل خاندان کے ساتھ ''منزل مراد'' کی تلاش میں رخت سفر باندھا، ذہین تھے۔ حالات حاضرہ پر گہری نظر تھی۔ شاعری کے ساتھ صحافت میں بھی سرگرم ہوگئے اور رفتہ رفتہ سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والوں سے تعلقات استوار ہونے لگے اور ''منزل مراد'' کی تلاش میں آنے والوں کے گروہ میں شامل ہوگئے اور پھر یوں ہوا کہ منزل مراد ان کا مقدر بن گئی۔ کان کی لُو کے اعتبار سے بھی منفرد ہیں۔ علم قیافہ کے ماہرین کا کہنا ہے کہ کان کی لو موٹی ہو اور اس پر ایک لمبی اور گہری لکیر بھی نمایاں ہو تو ایسا شخص دل کے امراض میں مبتلا ہوسکتا ہے مگر مشاہدہ اور مطالعہ بضد ہے کہ ایسے افراد قوم کو دل کا مریض بنانے کے ماہر ہوتے ہیں۔

سید سردار علی کب تابش الوری بنے، اس سافت میں اتنی دھول اڑی ہے کہ سب کچھ گرد آلود ہوگیا ہے مگر ان کی پیشانی پر چمکتے دمکتے مہر تاباں کی روشنی میں یہ منظر بہت روشن ہے کہ بہاول پور ایک مہربان شہر ہے اس کی شفقت ماں کی گود کی طرح وسیع ہے۔ تابش الوری اس کی گود میں پروان چڑھے اور پھر عزت و شہرت کی منزل ان کے قدم چومنے لگی۔

معروف صحافی ہیں، ممتاز شاعر ہیں، نامور ادیب ہیں، مشہور سیاست دان ہیں۔ وطن عزیز میں کسی سیاست دان کا نیک نام ہونا ایک ایسا اعزاز ہے، جو شاذ و نادر ہی کسی کا مقصوم ٹھہرتا ہے۔

اچھے غزل گو شاعر ہیں مگر قطعات اور رباعیات لکھتے وقت ان کی فکری بلندی پاک چین دوستی کی طرح ہمالیہ کی بلندی کو چھونے لگتی ہے۔ رئیس امروہی کے وصال کے بعد روزنامہ جنگ میں قطعات لگے تھے۔ مگر مرحوم کی پیشگوئی آڑے آ گئی۔ رئیس امروہی نے عالم کون وفساد سے رخصت ہونے سے قبل کہا تھا۔ میرا جانشین انور شعور ہوگا سو، انور شعور کے سوا کوئی بھی شاعر اپنا رنگ نہ جما سکا۔

سید تابش الوری کی شخصیت کا جائزہ لیا جائے۔ ان کے حسب نسب پر غور کیا جائے تو ان کا ادبی اور سیاسی شجرہ مولانا ظفر علی خان، مولانا محمد علی جوہر اور حسرت موہانی کے قبیلے سے جاملتا ہے۔ ان کا نعتیہ کلام، سرکار دو عالم، ادبی تاریخ کا بے مثال تخلیقی شاہکار ہے۔ پہلی بار 2004ء میں شائع ہوا تھا اس کی مقبولیت اور اثر پذیری سے متاثر ہوکر حکومت پاکستان نے تمغہ امتیاز، حکومت پنجاب نے سیرت ایوارڈ اور ادبی تنظیموں نے ادبی اعزاز عطا کیا۔ سرکارِ دو عالم کو دوسری بار 2018ء میں نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام نے شائع کیا۔ حیرت ہے ڈاکٹر انعام الحق نے ایک مضافاتی شاعر کو انعام سے کیسے نواز دیا۔ شاید تابش الوری کا سیاست دان ہونا کام آ گیا ورنہ...... ادب کے یہ ٹھیکیدار چھوٹے شہروں کے شاعروں کو دیہاتی کہہ کر مذاق اڑاتے ہیں حالانکہ دیہاتی شاعروں کا کلام سن کر ان کے ہاتھوں کے توتے اڑ جاتے ہیں۔ بعض اوقات تو ان کی تو تیاں بھی اڑ جاتی ہیں۔

1983ء میں راغب مراد آبادی نے نعتیہ کلام ''مدح رسول'' لکھ کر شاعروں کو غیر منقوط صنف کی جانب راغب کیا۔ غیر منقوط شاعری ایک انتہائی مشکل کام ہے مگر بہاول پور کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہاں کے شاعروں نے اس پر طبع آزمائی کر کے قادر الکلام ہونے کا ثبوت

پیش کیا۔ ستر کی دہائی میں ڈاکٹر نصرت جعفری نے غیر منقوط نعتیں کہیں، اَسی (80) کی دہائی میں محمد حسین آزاد نے پنجابی زبان میں منقوط غزلیں بھی لکھیں۔ ان دنوں خادم حسین مخفی سرائیکی زبان میں غیر منقوط نعتیں تحریر کررہے ہیں۔ سنا ہے شجاع آباد کے ممتاز شاعر ظفر اقبال بھی غیر منقوط غزلیں اور نعتیں لکھ رہے ہیں انہوں نے واقعہ کربلا کو غیر منقوط منظوم کیا ہے۔

معروف شاعر اور نعت گو خورشید نے غیر منقوط نعتیہ اور حمدیہ کلام پر بہت کام کیا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب اور حسب حال ہوگا کہ انہوں نے خود کو غیر منقوط کلام کیلئے وقف کردیا ہے قبل ازیں موصوف جدید غزل گو شاعر کے طور پر خاصے ممتاز اور معروف تھے۔ نثری شاعری میں بھی خوب نام کمایا ہے مگر اب ان کی پہچان غیر منقوط کلام بن چکی ہے۔ اس ضمن میں یہ بات خاصی حیرت انگیز ہے کہ غیر منقوط کلام کی ابتدا بہاول پور کے دور افتادہ علاقے کے ایک ادیب نے کی تھی جو مغل بادشاہ اکبر کے نورتنوں میں شامل تھا۔ غالباً اس کا نام ابوالفضل فیضی تھا۔

دراصل غیر منقوط کلام ایک ہلمانہ خصوصیت ہے جس کی توفیق مقدر ہی سے ملتی ہے۔ تابش الوری کا کمال یہ ہے کہ ان کے غیر منقوط کلام میں آورد کا گمان نہیں ہوتا ہر شعر آمد کا مظہر دکھائی دیتا ہے۔

ہم دم علیگ مرحوم صدارتی ایوارڈ یافتہ ادیب تھے آخری عمر میں نثر چھوڑ کر شاعری کرنے لگے تھے مگر ماہرالقادری نے یہ کہہ کر ان کی شاعری مسترد کردی تھی کہ ہر منظوم کلام شاعری نہیں ہوتا۔ شاعری غنایت کی متقاضی ہوتی ہے۔ تعقید لفظی اور تعقید معنوی پر مبنی شاعری نہیں ہوتی، منظوم کلام ہوتا ہے۔ ''سرکارِ دو عالم'' کا کمال یہ ہے کہ اس میں سلاست ہے، روانی ہے، غنایت ہے۔ ان دنوں غلام فرید کے سرائیکی کلام کا اردو میں ترجمہ کررہے ہیں۔ اب تک جو ترجمہ کیا ہے طبع زاد لگتا ہے جو ان کے قادرالکلام ہونے کا ثبوت ہے۔ واقعی! ان کے باکمال ہونے میں کوئی شک نہیں اگر انہیں شاعر خوش کلام کہیں تو مبالغہ نہ ہوگا۔

دشت صحافت کا مسافر

خاکہ

علی احمد رفعت

ناصر حسنی

آدمی کی اپنی زمین سے پیوستگی مستحکم ہوتو ہر وابستگی بے معنی ہوکر رہ جاتی ہے۔

اگر ہم اس حوالے کو کردار کی پیمائش کا پیمانہ تصور کرلیں تو علی احمد رفعت کا ایک اعلیٰ و ارفع انسان ہونا ہر شک وشبہ سے بالاتر ہو جاتا ہے ان کی عملی زندگی کے تین نہایت واضح اور نمایاں پہلو ہمارے سامنے ہیں۔

ملازمت، تجارت اور ادب وصحافت

رفعت صاحب طبعاً سیماب صفت تھے، اس لئے ملازمت سے بہت جلد دستبردار ہو گئے اور تجارت شروع کردی مگر ان کے اندر کے بےکل فنکار نے انہیں کبھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔

دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا، فضائیں دھول آلود تھیں اور ماحول پر گھٹن طاری تھی رفعت مرحوم نے ریاستی ماحول سے اکتا کر رخت سفر باندھا اور دلی جا ٹھہرے مگر ہنگامہ پرور دلی بابا فرید کی سکون پرور روہی کے نقش نہ مٹا سکی کہ کوہستانیوں اور ریگستانیوں کی جڑیں اپنی زمین میں بہت گہری ہوتی ہیں زمین سے ان کی پیوستگی اتنی شدید ہوتی ہے کہ ''طوفان نوح'' بھی ان کے مقابل ندی کی لہر میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

وہ سیلان طبع تو تھے مگر سیلانی نہیں، سو بہت جلد بہاول پور لوٹ آئے اور یہاں سے ہفت روزہ ''ستلج'' کا اجراء کیا جو خالدہ رفعت اور اس کے شریک سفر فضل حمید کی شب وروز کاوشوں کے نتیجے میں روزانہ شائع ہونے لگا ہے۔

بہاول پور ایک مسلم ریاست تھی مگر اقتصادی اور معاشی اعتبار سے یہاں پر مکمل طور پر

ہندو کی حکمرانی تھی جو رفعت جیسے حساس انسان کے لیے قابل قبول نہ تھی۔انہوں نے ہنود کا طلسم توڑنے کیلئے تجارت کا آغاز کیا اور اس میدان میں خوب کھیلے مگر بہت جلد ان کو یہ احساس ستانے لگا کہ وہ کسی اور کی ''وکٹ'' پر کھیل رہے ہیں، ان کو اس حقیقت کا ادراک تھا کہ زندگی کو جمع تفریق کی نذر کر دینا حیوانیت ہے اور انسان خدا کے بزرگ و برتر کی احسن تخلیق ہے جو کسی احسن مقصد کیلئے دنیا میں وارد کی گئی ہے وہ اپنی قوم کو خوشحالی اور خود مختار دیکھنا چاہتے تھے مگر غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی قوم جسے سر اٹھا کر چلنے کی اجازت نہ ہو بھلا آنکھ کس طرح اٹھا سکتی تھی انہوں نے اپنی اس خواہش کو ایک مشن بنالیا اگر مشن کو عبادت سمجھ لیا جائے تو پھر کامیابی یقینی امر بن جاتی ہے رفعت جنت مکانی نے بھی اپنے مشن کو عبادت سمجھ لیا اور یوں وہ دشت صحافت میں در آئے۔ انگلیاں فگار ہوئیں پا شکستہ ہوئے مگر ان کے عزم واستقلال میں لغزش نہ آئی منہ کا نوالہ چھن جائے تو آدمی لاکھ پتھر ہو چیخ اٹھتا ہے مگر رفعت جو اسم بامسمیٰ تھے نے اپنے لبوں کو ایک مخصوص زاویے میں سکڑ کر رہ گئے جب بہت زیادہ دلبرداشتہ ہوئے تو قلم برداشتہ اداریہ نویس بن گئے۔

دراصل ہمارے مقامی اخبارات بیگار کیمپ ہی کی ایک قسم ہیں جہاں شب و روز کی جاں سوزی کے بعد صرف چند لقمے ہی معتبر آ سکتے ہیں زندگی کی آسائشیں تو ان کا مقدر بنتی ہیں جو لوگوں کی دکھتی رگوں پر ستار نوازی کا ہنر جگاتے ہیں۔

وہ ایک بیباک اور معتبر صحافی تھے،صحافت ان کے نزدیک تقدس کا درجہ رکھتی تھی انہوں نے کسی بھی مرحلہ پر اس کے تقدس کو پامال نہ ہونے دیا۔تنگ دستی میں بھی ان کا دل تنگ نہ ہوا انہوں نے اپنے پیشہ وارانہ تقدس کو بہر صورت عزیز رکھا،اس معاملہ میں وہ اپنے مخالف کے حامی اور حامی کے مخالف بن جاتے تھے۔

وہ بلند پایہ صحافی ہی نہیں ایک قابل قدر مترجم بھی تھے،وہ ترجمہ کے آداب اور اسلوب سے خوب آگاہ تھے اور اسی سمجھ بوجھ نے ان کو ایک محترم اور معتبر ترجمہ نگاروں کی صف میں کھڑا کیا۔انہوں نے اوٹو ہانس کے ناول Men with there faces کا ترجمہ اتنی مہارت اور

چابکدستی سے کیا ہے کہ ناول پر طبع زاد ہونے کا گمان ہونے لگتا ہے اور جب ہم اس ناول کے کردا روں کو اردو اور ہندی ناموں سے پکاریں تو یہ گماں بھی ختم ہو جاتا ہے۔

ریڈیو ڈرامے کی تاریخ میں ان کا نام ایک نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ انہوں نے اپنے قیام راول پنڈی کے دوران وہاں چند ڈرامے تحریر کئے تھے جن میں سے ایک ڈرامہ ''چاندکی دیوی'' نہ صرف مقبول عام کی سند رکھتا ہے بلکہ ایوارڈ یافتہ بھی ہے۔

انہوں نے افسانے بھی تحریر کئے تھے مگر اپنی آزاد منشی اور لاپرواہی کے سبب ان کو محفوظ نہ رکھ سکے۔

علی احمد رفعت کا المیہ یہ ہے کہ وہ اپنے ماحول اور اپنے معاشرہ سے اپنا رشتہ استوار نہ رکھ سکے مگر ان کی سب سے بڑی خوش نصیبی یہ ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری کا رشتہ زندگی سے مر بوط رکھا ان کی عظمت کا یہ پہلو بڑا درخشاں اور تابندہ ہے کہ انہوں نے زندگی کو نوازا ہے حالانکہ لوگ ہمیشہ ''درزیست'' کے گدا بنے رہتے ہیں۔

جہاں تک ان کی شاعرانہ حیثیت کا تعلق ہے بلاشبہ وہ اپنے وقت کے ایک بلند پایہ اور معروف شاعر تھے۔ ان کے ہاں شعری فضا اتنی مانوس اور اپنی اپنی سی ہے کہ آدمی خود کو وہاں سانس لیتا ہوا محسوس کرتا ہے یوں لگتا ہے جیسے یہ سب کچھ اس کی اپنی بیتا ہے اس کا اپنا مشاہدہ ہے اس کے اپنے دل کی بات ہے۔

انہوں نے اپنی شاعری کو ناجائز الفاظ کی آلائشوں سے مبرا رکھا کیونکہ انہیں اس حقیقت کا احساس تھا کہ ناجائز لفظوں کا فروغ ناجائز خون کی افزائش سے زیادہ مہلک اور تباہ کن ثا بت ہوتا ہے۔

ادیب کے قلم میں بھری ہوئی سیاہی کے قطرے بموں سے زیادہ ہلاکت خیز ہوتے ہیں حکمرانوں کی کسی ایک غلطی کا خمیازہ تو ایک ہی نسل کو بھگتنا پڑتا ہے مگر ادیب کا قلم بہک جائے تو آنے والی تمام نسلیں بھی اس لغزش کا تاوان ادا کرتی رہتی ہیں۔

علی احمد رفعت نے لسانی تشکیلات کے جنون میں اپنی تہذیب اور اپنی ثقافت کو تاراج نہیں کیا۔ مجھے یہ کہنے میں تردد نہیں کہ الفاظ اپنی علاقائی تہذیب اور اپنی جغرافیائی ثقافت کے امین ہوتے ہیں اور امانتیں بہر صورت مقدس ہوتی ہیں ان کے تقدس کی دیدہ دانستہ پامالی انسانی تمدن کی توہین ہے۔

علی احمد رفعت ایک کامیاب تاجر تھے قابل قدر استاد تھے، محنتی محقق اور مایہ ناز شاعر تھے۔ بے باک اور بے خوف صحافی تھے اور نجانے کیا کچھ تھے مگر میری دانست میں ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ایک محبِّ وطن انسان تھے اور وفاق پاکستان کے زبردست مبلغ تھے۔

قومی زبان سے ان کی محبت ایمان کا درجہ رکھتی تھی، اردو سے ان کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے گھر میں بھی اپنی مادری زبان کے بجائے قومی زبان ہی میں گفتگو کیا کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ جب پہلی بار خالدہ رفعت کو دیکھا تھا تو اسے اہل زبان فیملی کا ایک فرد سمجھتا تھا۔

اردو زبان سے محبت اور انسیت کے معاملہ میں وہ مولانا اشرف تھانوی کے مقلد تھے ان کے قول و فعل نے بارہا مولانا تھانوی کے اس قول کی تائید کی ہے۔

''اس وقت اردو زبان کی حفاظت دین کی حفاظت ہے اور باوجود قدرت کے اس میں غفلت اور سستی کرنا معصیت اور موجب مواخذہ آخرت ہوگا۔''

علی احمد رفعت اردو زبان کی حفاظت کو دین کی حفاظت سمجھتے تھے ان کی نظر میں زبان دبیان کے تقدس کی پامالی کفر کے مترادف تھی۔ یہاں ''تھی'' کا استعمال دانستہ کیا گیا ہے کیونکہ زبان و بیان سے عقیدت و احترام کا یہ جذبہ ان کی وفات کے بعد فوت ہو چکا ہے۔ بہاول پور پریس کلب کو اپنے لہو سے سینچا تھا۔ آج وہ زندہ ہوتے تو اس کی موجودہ صورتحال دیکھ کر زندہ در گور ہو جاتے۔ آج بہاول پور پریس کلب پر جس گروہ کا قبضہ ہے وہ لفظوں کے باطنی کیا ظاہری معنی سے بھی نابلد ہے۔ دیگ کا ایک چاول چکھنے اور ان کی علمیت اور قابلیت پر سر دھننے پر دوستوں کے کہنے پر ایک کالم نگار نے پریس کلب کی رکنیت کی درخواست دی تو یہ کہہ کر مسترد کر دی کہ کالم نویس

کو پریس کلب کی رکنیت نہیں دی جاسکتی کیونکہ وہ صحافت کے دائرے میں نہیں آ تا یہ ''صحافتی دائرہ'' کیا ہوتا ہے ہم اس کی وضاحت نہیں کر سکتے کیونکہ اس کا دائرہ کار صحافت سے مختلف ہوتا ہے۔ بہت ہی مختلف البتہ پریس کلب بہاول پور کے کرتا دھرتاؤں کی عقل کا ماتم کر سکتے ہیں۔ انہوں نے صحافت کا علم تو اُجاگر کیا مگر یہ علم جس ڈنڈے پر لہرا رہا ہے، وہ کوکھلا ہے۔ انہیں اس حقیقت کا ادراک ہی نہیں کہ کالم نویس سینئر رپورٹر ہوتا ہے۔

آتش ابھی جوان ہے

خاکہ

ڈاکٹر پروفیسر ذیشان اطہر

ناصر حسنی

گورا رنگ، نشیلی آنکھیں، گداز جسم، بوٹا سا قد مگر یہ میر صاحب کا بوٹا نہیں جو گل کی دوستی میں چمن کو بے خبر رکھتا ہے۔ اسی کا حال تو سارا چمن جانتا ہے۔ خاندانی نام ابوذر منیر ہے۔ جسے سن کر ہمیں ایک بزرگ یاد آنے لگتے ہیں مگر اس سے قبل پاک و ہند کے ممتاز شاعر منور رانا کا یہ شعر سنئے:

اچھلتے کھیلتے بچپن میں بیٹا ڈھونڈتی ہوگی
تبھی تو دیکھ کے پوتے کو دادی مسکراتی ہے

اور بزرگ کا قصہ کچھ یوں ہے کہ بوڑھی عورت نے اپنے پیر سے کہا۔ حضرت صاحب! سبھی آپ کو حضرت صاحب! حضرت صاحب کہتے ہیں آپ کا کوئی نام بھی تو ہوگا؟؟

بزرگ نے کہا: میرا نام ابو مجیب ہے۔ بڑی بی نے پھیپڑے شگاف قہقہہ لگایا اور بولی آپ کی اماں جان کو دادی بننے کا بہت شوق تھا اور عقیدت مندوں کی محفل زعفران زار بن گئی۔

آنکھوں میں لحاظ، لبوں پر مسکراہٹ، دل میں گداز رکھتے ہیں۔ سو، سب کے دوست ہیں اور سبھی ان کے دوست ہیں۔ دشمنی پالنے کے بجائے پوت کے پاؤں پالنے میں دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے رہتے ہیں۔ پتہ نہیں کس نوشی سے بدظن ہو کر سگریٹ نوشی پر مائل ہوئے، سبھی جانتے ہیں کہ بلانوش ہیں مگر کوئی یہ نہیں جانتا کہ کتنی بلائیں نوش کر چکے ہیں چونکہ ہمارا تعلق کئی عشروں پر محیط ہے سو ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ انہیں پیش قدمی کی عادت نہیں۔

بیروزگاری کے زمانے میں ظہور آثم کے گفٹ سنٹر پر اکثر ملاقات ہوا کرتی تھی۔ اعجاز توکل بھی ہمراہ ہوا کرتے تھے اور دونوں حضرات اپنے اپنے خیالات کے گفٹ دیا کرتے تھے انہی

دنوں یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ ابوذر منیر، ذی شان اطہر اس لیے بنا کہ کہیں اس کے بطن سے کوئی منو بھائی برآمد نہ ہو جائے، ویسے یہ معاملہ خاصا سنگین ہے مرجوع کی نوبت بج سکتی تھی۔ ایسے امکان کو کیسے مسترد کیا جا سکتا ہے کہ منو بھائی سے بھی بڑا کوئی شخص زبان سے چمٹ سکتا تھا۔ ابوذر کو اختصار کے ساتھ بھی تولا جا سکتا تھا۔ ظہور آثم کے گف سینٹر پر بڑی کھلی ڈھلی گفتگو ہوا کرتی تھی۔ دوران گفتگو کئی بار یہ احساس ہوا کہ خواتین شعراء کی شاعری سے زیادہ ان کی آواز کے زیر و بم میں ڈبکیاں لگانا پسند کرتے ہیں مگر شادی کے بعد یہ بات ان کی سمجھ میں آ گئی کہ ہر عورت اچھی شاعرہ ہوتی ہے۔ اچھی مقرر ہوتی ہے۔ اچھی استاد ہوتی ہے۔ ذی شان اطہر نے قلم پکڑنا تو خود سیکھا ہے مگر ٹوتھ برش پکڑنا اہلیہ محترمہ نے سکھایا ہے۔ واقعی! اہلیہ کا اہل ہونا بہت ضروری ہوتا ہے۔ شاید اسی لیے اشتہار باز اہل شہر کے بجائے اہلیان شہر سے مخاطب ہوا کرتے ہیں۔

شادی سے پہلے آدمی بالغ ہوتا ہے اور شادی کے بعد بلیغ ہو جاتا ہے اور اگر قسمت کی دیوی مہربان ہو جائے تو بلیغ شریف بھی بنا جا سکتا ہے۔ ان باتوں کو یہ کہہ کر نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس وقت آتش جواں تھا۔ آتش تو اب بھی جواں ہے۔

ذیشان کا یہ کہنا مقبولیت کے منصب پر فائز دکھائی دیتا ہے کہ کلام شاعر کے بجائے کلام شاعری بذبان شاعرہ ہی بھلا لگتا ہے اس کا لطف ہی کچھ اور ہے کیونکہ شاعرہ سراپا شاعری ہوتی ہے۔

شنید ہے جب سے ادب کے ڈاکٹر بنے ہیں شاعروں کو نثری نظم کہنے لگے ہیں اور شاعرات ان کی نظر میں سراپا غزل ہوتی ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کراچی کو یہ کہہ کر چھوڑ دیا تھا:

جیسے بھی ہو اس شہر سے ہجرت کرو ذی شان
اس شہر میں ایمان کوئی بھی نہیں رکھتا

اور اب یہ گنگناتے ہوئے پائے جاتے ہیں:

انگلیاں اٹھتی ہیں ہر سمت سے رسوائی ہے

زندگی تو مجھے کس شہر میں لے آئی ہے

کالج میں پڑھاتے ہیں مگر قد وقامت اور چہرے کی معصومیت سے طالب علم دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی پہلی تعیناتی یزمان کالج میں ہوئی تھی۔ پارٹ ٹائم میں کلاسوں سے دور ایک درخت کے سائے تلے سگریٹ نوشی فرمارہے تھے۔ اچانک پرنسپل صاحب کی نظر پڑی تو ایک طالب علم سے کہا۔ اس لڑکے کو پکڑ کر لاؤ، ہزار بار سمجھایا ہے کہ کالج کی حدود میں سگریٹ مت پیا کرو مگر آج کی نسل اتنی خودسر ہے کہ کسی کی بات ہی نہیں سنتی یہ حکم سن کر طالب علم ہنسنے لگا۔ پرنسپل صاحب کا پارہ اتنا چڑھا کہ طالب علم پر چڑھ دوڑے۔ کہنے لگے۔ گستاخ لڑکے تم اس لڑکے کو بلانے کی بجائے میرا تمسخر اڑا رہے ہیں۔ سر میں ایسی گستاخی کیسے کرسکتا ہوں۔ مجھے اس لیے ہنسی آرہی ہے کہ جسے آپ اسٹوڈنٹ سمجھ رہے ہو وہ ہمارے نئے پروفیسر ذی شان اطہر ہیں۔ اچھا! مگر وہ تو اسٹوڈنٹ دکھائی دے رہا ہے۔

چند برس یزمان کی خاک چھاننے کے بعد بہاول پور آ گئے۔ ان دنوں پوسٹ گریجویٹ کالج میں پڑھا رہے ہیں۔ پڑھائی کے دوران خود بھی پڑھتے رہے سو۔ اب اردو ادب کے ڈاکٹر ہیں اور نیم پلیٹ پر بھی پروفیسر ڈاکٹر ذی شان اطہر لکھوالیا ہے۔ مگر ڈاکٹر ایٹ کی سند ایک دلچسپ مصیبت بن گئی۔

رات کے کسی پہر دستک سن کر آنکھ کھل گئی دروازہ کھولا تو ایک شخص منت آمیز انداز میں فریاد کناں ہوا۔ ڈاکٹر صاحب جلدی چلیے ہمارے بندے کی طبیعت بہت خراب ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑی مشکل سے جان چھڑائی۔ اسی طرح کے واقعات سے متاثر ہوکر ہم نے اسی (80) کی دہائی میں تجویز دی تھی کہ ادب کے ڈاکٹر کو علامہ لکھا جائے مگر نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ کو علامہ لکھنے والے خود کو علامہ لکھنے میں سبکی محسوس کرتے ہیں۔

ایم اے کرنے کے بعد ذی شان اطہر کو یقین تھا کہ کوئی ذی وقار ملازمت مل جائے

گی۔مگر وہ یہ بھول گیا کہ وطن عزیز میں ملازمت اسے ملتی ہے جو سونے کے چمچ کے ساتھ تقرری کا پروانہ لے کر پیدا ہوتا ہے۔

بے روزگاری سے تنگ آ کر ذی شان اطہر نے ذہنی مہارت کا اہتمام کر ڈالا۔خدا جانے اس نے کیسا منتر پڑھا کہ ایک پبلشر اس کا شعری مجموعہ شائع کرنے پر کمر بستہ ہو گیا۔ہم یہ نہیں بتا سکتے کہ کمر کس کی تھی اور بستہ کس کا تھا؟ ہم نے صرف اتنا دیکھا کہ کچھ دنوں کے بعد ذی شان اطہر خیمہ اٹھائے چلتے دکھائی دیئے اور یار لوگوں کے اس خیال کو غلط ثابت کر دیا کہ یہ حضرت تو رخت سفر اٹھا کر نہیں چل سکتے۔

صاحب کتاب ہونے والے کا آٹا گیلا ہو جاتا ہے۔ذی شان اطہر کا آٹا بھی گیلا ہو گیا تھا مگر اس سے پہلے کہ آٹا خمیرہ ہوتا محترم کو ملازمت مل گئی پہلے لیکچرر ہوتے۔پھر پروفیسر بنے اور اب پروفیسر ڈاکٹر بن گئے ہیں۔

صائب الرائے

خاکہ

پروفیسر سہیل اختر

ناصر حسنی

ستر کی دھائی میں عصر کے بعد پروفیسر سہیل اختر اور سید آل احمد فرید گیٹ پر کھڑے ہو جاتے تھے اور باہر سے آنے والے شاعر و ادیب ان کے توسط سے مطلوبہ ادیب یا شاعر تک با آسانی پہنچ جایا کرتے تھے۔ پروفیسر سہیل اختر اور سید آل احمد بڑے قد آور تھے، گوری رنگت نے ان کی شخصیت کو اور نکھار دیا تھا۔ سید آل احمد کھلنڈرے مزاج کے تھے ان کی آنکھوں میں شرارت ناچتی رہتی اور پروفیسر سہیل اختر کی آنکھوں سے شراب ٹپکتی رہتی۔ دونوں ہی متضاد طبیعت کے مالک تھے مگر شاعری نے اس تضاد کو متضاد ہونے نہیں دیا۔ پروفیسر سہیل اختر سے ہماری پہلی ملاقات غالباً 1975ء میں ہوتی تھی۔ ہم اکثر سٹلائٹ ٹاؤن سے گزرتے تو پروفیسر صاحب سے دعا سلام ہو جاتی تھی۔ اس وقت ہمیں شاعری کا چسکا لگا ہوا تھا۔ ایک دن ہم نے پروفیسر صاحب سے کہا، سر! مجھے شاعری کا شوق ہے۔ اجازت دیں تو اصلاح کیلئے حاضر ہو جایا کروں۔ کہنے لگے۔ کل دو تین غزلیں لے آنا قابل اصلاح ہوئیں تو اصلاح کر دوں گا ورنہ...... وقت برباد نہ کرنے کا مشورہ دوں گا۔ دوسرے دن ہم دو غزلیں لے گئے۔ پہلی غزل سنائی تو کہا اصلاح کی ضرورت نہیں بالکل درست ہے مگر دوسری غزل سن کر کہنے لگے۔ شاہ جی! یہ کیا؟ پہلی غزل تو بالکل درست ہے مگر دوسری غزل فارغ ہے، بے وزن ہے۔ ہم نے کہا۔ سر! پہلی غزل مصرعہ طرح پر کہی ہے۔ دوسری غزل کے ردیف، قافیے، خود چنے ہیں۔ پوچھا۔ نثر بھی لکھتے ہو۔ ہم نے کہا۔ افسانے لکھتا ہوں۔ ٹھیک ہے۔ کل ایک افسانہ لے کر آنا۔ دوسرے دن ہم ایک افسانہ جیسی کرنی ویسی بھرنی، جیسے دقانوسی عنوان کے ساتھ حاضر ہوئے۔ افسانہ سنا، الماری سے لفافہ نکالا۔ ماہنامہ محفل لاہور کا ایڈریس لکھا اور کہا۔ اسے پوسٹ کر دو۔ ہم نے افسانہ محفل لاہور کو بھیج

دیا۔ دوسرے ماہ شائع ہوگیا۔ پروفیسر صاحب نے نصیحت کی کہ تم موزوں طبع نہیں ہو اس لیے شاعری میں وقت برباد مت کرو۔ افسانے لکھا کرو اور ہم نے ان کی بات دو پٹانہ ہونے کے باوجود پلو سے باندھ لی چند سال بعد مذکورہ افسانہ کراچی کے ایک ڈائجسٹ میں ''گرداب'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ سیانوں نے سچ ہی کہا ہے۔ مشورہ بہت ضروری ہے۔ خواہ دیوار ہی سے کیوں نہ کہا جائے۔ ذات شریف کا اسم شریف کیا تھا شاید وہ خود بھی بھول گئے تھے۔ اپنے تخلص سہیل اختر ہی سے جانے پہنچانے جاتے تھے۔ دہری شخصیت کے مالک تو بہت دیکھے ہیں لیکن دہرے تخلص کے غالباً پہلے شاعر ہیں اگر سگریٹ واقعی نوش کیا جاتا ہے تو ان کو بلانوش کہا جاسکتا ہے کہ ہمہ وقت ان کی انگلیوں میں سلگتا، بلکتا، سگریٹ تو چل میں آیا، کا ورد کرتا رہتا ہے۔ فنکار عموماً خود کو ساری دنیا کا شہری سمجھتے ہیں اس لیے ان کی حب الوطنی ذرا مشکوک ہو جاتی ہے مگر ان کو اپنے وطن سے جو لگاؤ ہے اس کی شہادت ان کے حلیے سے ملتی ہے۔ تیل کنگھے سے بے نیاز بال کسی الیے پہ سینہ کوبی کرتے رہتے ہیں سنا ہے ان کو اپنا سنہرا رنگ دیکھ کر ''سنہرا دیش'' یاد آجاتا ہے۔ اس لیے ان کی حتی الامکان کوشش ہوتی ہے کہ شیشہ نہ دیکھا جائے۔ نہ جانے اپنی آنکھوں میں کتنے پیکر بسائے بیٹھے ہیں جن کی دھما چوکڑی ان کو بے خواب رکھتی ہے ان کی آنکھوں سے جھلکتا نشہ شراب کی عنایت نہیں قدرت کا عطیہ ہے۔ جہاں تک ان کے اختر ہونے کا تعلق ہے ہم ان سے متفق ہیں۔ لیکن ان کا سہیل ہونا ہمارے نزدیک مشکل ہے کیونکہ ان کی سعی بسیار کے باوجود بہاول پور میں سینکڑوں شاعر حشرات الارض کے مانند رینگتے پھرتے ہیں۔ بڑے رومانٹک مزاج کے شاعر ہیں ہمیشہ ہی لب و رخسار کی معجز نمائی دکھاتے ہیں۔ ہجر و فراق کے قصے سناتے ہیں۔ بالوں کے جنگل میں پگھلتی چاندی بھی ان کی آنکھوں میں چٹکتی چاندنی کو ماند نہ کرسکی روز اول کا ولولہ اور عنوان شباب کی امنگیں ہنوز توانا ہیں۔ ان کی دراز قامتی میں سرو کا بانکپن ہے چال میں مور کا غمزہ ہے۔ قہقہوں کی کھنک میں مینا کا ترنم ہے وہ اپنی کتابوں کو رائج الوقت سکہ گردانتے ہیں اور اپنے ہر عقیدت مند سے عندالطلب بھنا لیتے ہیں۔ ضرورت سے کچھ زیادہ راست گو ہیں اس لیے ان کا من مندر ہمیشہ

ہی کربناک چیخوں سے گونجتا رہتا ہے

غزل کے نو واردوں کے ساتھ دیتے ہیں بادہ قدح خوار دیکھ کر۔ کا سا سلوک روا رکھتے ہیں اس لیے مغرور خود پسند سمجھے جاتے ہیں۔ پرائے ہاتھ پر شکرا پالنے والے شاعروں کے خیال میں وہ نئی پود سے لرزاں براندام ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ وہ بڑے صائب الرائے ہیں اور آدمی کا المیہ یہ ہے کہ وہ خوش فہمی میں مبتلا رہتا ہے یا پھر غلط فہمی کے اونچے مینارے پر مسند نشیں ہوتا ہے۔ شکل و شباہت اور چال ڈھال سے بے فکرے نواب دکھائی دیتے ہیں۔ پیشہ تدریس ہے انگریزی ادب کے مترجم ہیں جو ایک منافع بخش کاروبار ہے اور ادب کی خدمت بھی ایک پنتھ دو کاج اسی کو کہتے ہیں۔ آدمی ذرا شب بیدار ہیں مگر عابد شب بیدار نہیں۔ دوسروں کے معاملے میں بڑے راست گو ہیں اس لیے صدیق نہیں۔ ادبی اجلاسوں میں تخلیق پیش کرنا یا وہاں تنقید کرنے کو تشہیر کی گھٹیا حرکت گردانتے ہیں مگر یہ تضاد غور طلب ہے کہ وہ خود ایک ادبی بزم فلسفہ فکر و فن کے صدر محترم ہیں۔ کھل جا سم سم کی صدا پر بھی جب ''درِ جاناں'' وا نہ ہوا تو ''لہو کے دیپ'' جلا کر دھونی رمائی، ''قاتل کمپیوٹر'' کو دیکھ کر، ''صلیب درد'' پر لٹکے مگر مراد بر نہ آئی تو پھر ''کاسہ دل'' لیے کھلی کھڑکی سے ''بزم جاناں'' میں کود پڑے خدا جانے وہاں کیا گزری کہ ان دنوں ''کرب تنہائی'' کے فشار میں گرفتار ہیں۔

عابد شب بے دار

پروفیسر عابد صدیق

خاکہ

نام عابد صدیق ہے مگر بے تکلف دوست عابد شب بے دار کہتے ہیں۔قد و قامت اور نقش و نگار کے اعتبار سے مردانہ وجاہت کا شہکار دکھائی دیتے ہیں۔ ہنستے ہیں تو آنکھیں مسکرانے لگتی ہیں اور چہرہ گلاب کی طرح کھل اٹھتا ہے۔کسی بھی تحریر کی معنویت سے زیادہ اس کے بین السطور کو اہمیت دیتے ہیں ادبی اجلاسوں کی جان ہیں ان کی نظر میں ادیب و شاعر کیلئے پی ایچ ڈی ہونا بہت ضروری ہے اس سے کم تعلیم یافتہ شخص کو اہمیت نہیں دیتے مگر تنقیدی اجلاس میں سب کو ایک نظر سے دیکھتے ہیں۔

اردو مجلس کے ایک تنقیدی اجلاس میں ظہور آثم نے ایک شعر میں برفیں کا لفظ استعمال کیا تھا۔کسی ناقد نے کہا برف کی جمع برف ہی ہے۔ برفیں کے استعمال سے نہ صرف سماعت ہی کو بلکہ شعریت کو بھی بری طرح مجروح کیا ہے۔ یہ سنتے ہی عابد صدیق کے لبوں پر شوخ تبسم مچلنے لگا۔آنکھیں مسکرانے لگیں اور چہرہ گلاب کی طرح کھل اٹھا وہ حضرت تنقید سے فارغ ہوئے تو عابد صدیق نے یہ کہہ کر انہیں فارغ البال کر دیا کہ آپ نے اپنے ایک شعر میں پانیوں کا استعمال کیوں کیا ہے جبکہ پانی کی جمع پانی ہے پانیوں نہیں۔

وفاداری بشرط استواری کے قائل ہیں ان کی وفاداری اردو مجلس سے استوار تھی سو، ان کی خواہش یہی رہی ہے کہ بہاولپور کے تمام ادیب اور شاعر بھی اردو مجلس کے وفادار رہیں اور ادھر ادھر نہ دیکھیں ۔ ڈاکٹر فرحت عباس آج کل راولپنڈی میں تعینات ہیں اس وقت بہاول پور میڈیکل کالج میں زیر تعلیم تھے ۔قلم قبیلہ کے اجلاس سے فراغت پا کر اردو مجلس کے اجلاس میں آئے خدا جانے اردو مجلس والے بند کمرے میں اجلاس کیوں پسند کیا کرتے تھے۔عابد صدیق نے دروازہ کھولا اور پھر بند کر دیا دوسرے دن فرحت عباس نے عابد صدیق کے سلوک کا شکوہ کیا تو ہم

نے کہا۔ہمیں بلاتے ان کے غبارے سے ہوا نکل جاتی کیونکہ ہمارے ساتھ روزنامہ مغربی پاکستان کے کاتب رئیس احمد اور جدید لب ولہجے کے شاعر ظہور آثم کے علاوہ ایک دو اور بھی ہمارے بائی کاٹ میں شامل ہوجاتے۔

بعض احباب کا خیال ہے کہ عابد صدیق مجلسی آدمی ہیں۔مگر کسی نے انہیں مجلس میں آتے جاتے نہیں دیکھا۔شاعر ہیں سو، مزاج کا عاشقانہ ہونا ایک فطری عمل ہے بزم آرائی کے دلدادہ ہیں اور تنہائی کے طلب گار بھی بہت ہیں تبھی کہا ہے:

شہر والوں کی ہوس پھیلی تو کالونی بنی۔۔۔۔۔۔۔ایک ویرانہ قرین شہر تھا وہ بھی گیا

ایک دن عشاء کی نماز کے بعد خورشید ناظر کے گھر گئے۔انہوں نے بیٹھک کھول کر اندر آنے کی دعوت دی تو کہنے لگے بھائی میاں! موسم بہت خوشگوار ہے اس سے لطف اندوز ہونے کے لیے باہر آنا پڑے گا۔خورشید ناظر گھر سے باہر آئے تو گلی میں مٹر گشت کرتے ہوئے ایک زیر تعمیر مکان کے پاس آئے اور وہیں بیٹھ کر خورشید ناظر کو بھی فرش محمدی پر بیٹھنے کی دعوت دی اور پھر باتوں ہی باتوں میں کہنے لگے:

بھائی میاں! تم نے یہ کیا بدعت پھیلا رکھی ہے۔خورشید ناظر نے حیران ہوکر پوچھا میرے محترم دوست! میں سمجھا نہیں تم کہنا کیا چاہتے ہو۔ بھائی میاں! تم سے ادب کے علاوہ اور کس موضوع پر گفتگو کی جاسکتی ہے۔ یہ جو تم نے نثری نظم کی بدعت پھیلائی ہوئی ہے، میں اسی کے متعلق کہہ رہا ہوں۔ بھائی میاں! تحریر کوئی بھی ہو وہ نثر ہوتی ہے یا نظم ہوتی ہے تم نے ایک تیسری قسم بھی ایجاد کر ڈالی اور اسے نثری نظم کہتے ہو۔تم نے ادب میں بھی شی میل پیدا کر دیا ہے۔ بھائی میاں! کیوں نوجوان شاعروں کو خراب کر رہے ہو۔بس کرو اس بدعت سے تائب ہو جائے۔ورنہ نئی نسل کا بیڑا غرق ہوجائے گا۔خورشید ناظر نے کہا کہ میرے دوست! نثری نظم میری پھیلائی ہوئی بدعت نہیں ہے یہ تو اسی وقت معرض وجود میں آ گئی تھی جب انسان نے بولنا شروع کیا تھا اب یہ ایک الگ بات ہے کہ ہماری پہنچ سے دور رہی، ہماری اس تک رسائی نہ ہوسکی۔ پھر

خورشید ناظر نے فرانس، کلکتہ اور کراچی کے ادیبوں کے حوالے سے ایک لمبی چوڑی تقریر کر ڈالی۔ تقریر سن کر عابد صدیق کہنے لگے:

بھائی میاں! بہت ہوگیا، اب میں کل ریڈیو پر نثری نظم پر کھل کر بات کر سکوں گا اور خورشید ناظر اپنی نیند کی بربادی کا ماتم کرتے ہوئے گھر آ گئے۔ عابد صدیق کی کتاب پانی میں آفتاب شائع ہوئی تو ہم نے اپنے کالم میں کہا پروفیسر عابد صدیق اہل کتاب تو پہلے ہی تھے اب صاحب کتاب بھی ہو گئے ہیں اردو مجلس کے اجلاس میں ملاقات ہوئی تو جواب طلبی ہوگئی مگر ان کی عظمت کے آگے ہماری ایک نہ چلی دوسرے ان کا احترام آڑے آ گیا جان چھڑانا مشکل ہو گیا۔ محترم خورشید کی رگ ظرافت بھڑک اٹھی۔ کہنے لگے یہ آئیں بائیں کیا کر رہے ہو۔ پروفیسر صاحب کو مدلل جواب دو یا معافی مانگو۔ ٹھیک ہے بھائی جان ہم خورشید ناظر کو بھائی جان کہا کرتے تھے۔ ہم نے کہا:

پروفیسر صاحب یہ تسلیم کریں کہ وہ اہل کتاب نہیں ہیں تو ہم پاؤں پکڑ کر ناک رگڑ کر معافی مانگ لیں گے۔ پروفیسر صاحب کی رگ علمیت پھر بھڑک اٹھی۔ بولے یہود و نصاریٰ بھی تو اہل کتاب ہیں۔

اس معاملے میں تمام دوستوں نے ہماری حمایت کی۔ پروفیسر صاحب کو سمجھایا کہ عابد صدیق، صاحب کتاب ہو گئے ہیں لکھنا اخباری خبر لگتا ہے۔ ناصر حسنی نے اخباری خبر میں جمالیاتی عنصر شامل کر کے اس خبر کو خوبصورت بنا دیا ہے۔ بات عابد صدیق کی سمجھ میں آ گئی اور ہماری جان میں جان آ گئی۔

سراپا جمال

خاکہ

پروفیسر ڈاکٹر قاسم جلالؔ

تحریر: ناصر حسنی

نام سید قاسم، تخلص جلال ہے مگر ان میں جلال نام کی کوئی چیز نہیں سراپا جمال ہی جمال ہیں۔ البتہ ان کے اسم باسمٰی ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے اپنا علم بڑی فراخ دلی سے تقسیم کیا ہے۔ غالباً وہ بہاول پور کے واحد استاد شاعر ہیں جنہوں نے نو آموز شاعروں کی اتنی بڑی کھیپ تیار کی ہے جس کی گنتی ممکن نہیں مگر اس کھیپ نے سید صاحب کو اتنا کھپایا کہ نو آموز شعرا سے الرجک ہو کر گوشہ نشیں ہو گئے۔ ان کے ایک شاگرد رشید کا کہنا ہے کہ ان کی گوشہ نشینی کا باعث ہم نہیں، ان کا ہم نشیں، ہونا ہے۔ کسی حد تک اس سے متفق ہوا جا سکتا ہے کہ اکثر شریف آدمی شادی کے بعد گوشہ نشیں ہو جاتے ہیں۔

مترجم ہیں، افسانہ نگار ہیں۔ محقق ہیں، نقاد ہیں۔ خوش خلق ہیں، خوش کلام ہیں، خوش گلو ہیں، خوش قدم ہیں۔ چلتے ہیں تو یوں لگتا ہے کہ جیسے زمین پر نہیں خلا میں تیر رہے ہوں، کوئی راج ہنس پانی میں چل رہا ہو۔

لگ بھگ تیس کتب کے خالق ہیں جنہیں دیکھتے ہی مخالفین کے ذہن بھک سے اڑ جاتے ہیں۔ بقول شاعر:

ٹھیرا نہ چاند اس رخ انور کے سامنے
مہتاب کا سا نور تھا، وہ بھک سے اڑ گیا

ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ اردو کے علاوہ پنجابی، سرائیکی اور فارسی کے کئی شعری مجموعے منصۂ شہود پر آ چکے ہیں مگر ابھی یہ طے کرنا باقی ہے کہ وہ شاہد ہیں یا مشہود ہیں۔ ویسے مشہور بہت ہیں۔ ادب کا کوئی ایسا مقام نہیں جہاں سید قاسم جلال نے اپنے جمال وجلال کے پرچم

نہ لہرائے ہوں ہم جھنڈے گاڑنے کی بات کرتے تو شاید کوئی نہیں مانتا کیونکہ شاہ جی ڈنڈے کے استعمال سے واقف ہی نہیں حالانکہ بچوں کو پڑھانا ان کا محبوب مشغلہ رہا ہے۔

ترجمانی جتنی آسان ہے، ترجمہ اتنا ہی مشکل فن ہے مگر فن کار ہونا مشکل ترین ہے۔ سید قاسم جلال نے اس مشکل راہگزر پر گامزن ہو کر اسے اتنا ہموار کر دیا ہے کہ ادب کی مسافرت، رفاقت بن گئی ہے۔ معاشرے میں کچھ ایسے ذہنی مریض پائے جاتے ہیں جو اپنی ذات کے سوا کسی کو تسلیم نہیں کرتے۔ میں نہ مانوں کا جذام ان کے جسم ہی کو نہیں روح کو بھی داغ دار کر دیتا ہے۔ یہ داغ اتنے گہرے ہوتے ہیں جو کسی بھی آئینے میں دکھائی نہیں دیتے۔ سید قاسم جلال اس رویے سے بہت دل برداشتہ ہوئے۔ شاعری کو اپنی داشتہ سمجھنے والوں نے انہیں سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ یہ درست ہے کہ سید قاسم جلال کے کلام میں تمنائیت سے زیادہ فکر کا عنصر پایا جاتا ہے۔ ان کی بلند و بالا فکر کے سامنے پستہ قامت نہیں ٹھہر سکتے تھے، سو وہ ناقد بن گئے۔ بلا جواز اور بے معنی تنقید کرنے لگے۔ معاملہ تنقید تک رہا تو وہ تحمل اور برداشت کے کمبل میں لپٹے رہے، کوشش اور خواہش کے باوجود اس کمبل سے جان نہ چھڑا سکے مگر کب تک! بالآخر! دل برداشتہ ہو کر لاہور کی جانب ہجرت کر گئے۔ مگر انہوں نے کبھی اس ہجرت کو تسلیم نہیں کیا۔ ان کی نظر میں ہجرت اپنی مٹی سے بغاوت کی ایک مہذب صورت ہے اور پھر وہ اس صورتحال سے اس وقت نکلے جب ان کی نورِ نظر ڈاکٹر بیٹی کا تبادلہ بہاول پور ہو گیا اور وہ بخیر و عافیت بہاول پور آ گئے۔ ان کے دل برداشتہ نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جن بچوں کو انہوں نے انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا تھا وہی ان پر انگلیاں اٹھانے لگے تھے۔ ہر انگلی امپائر کی انگلی تو نہیں ہوتی کہ اس کے اٹھنے پر آدمی اٹھلانے لگتا ہے۔

ان کی واپسی پر بہاول پور کے نابینا شاعر ظہور آثم نے سکھ کا سانس لیا۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ بصارت سے محروم ہے مگر لاہوری بے بصیرت ہیں۔ بے دید، بے لحاظ ہیں۔ سو، اسے یہ خدشہ لاحق تھا کہ کہیں لاہور کا پانی قاسم جلال کی بصیرت کو بہا کر نہ لے جائے۔ لاہور کے پانی نے قاسم جلال کو اپنی لپیٹ میں لیا تو سہی مگر مکمل طور پر اس کی گرفت میں نہ آ سکے۔ لاہوریت کے شکنجے

میں پھنسی گردن تو چھڑا لی مگر اپنے سر کے بال نہ بچا سکیں۔ تاہم قاسم جلال خوش ہیں کہ سرے سے اترے بال گٹر میں جائیں یا کسی حسینۂ بے زلف کی زینت بنیں، انہیں اس سے کوئی غرض نہیں۔ غرض بڑی تکلیف دہ ہوتی ہے آدمی اس سے دل لگا لے تو مجنوں بن جاتا ہے اور مجنوں کا نون سینہ تان کی آدمی کی ہر تان توڑ دیتا ہے۔ ظہور آثم سے اس تلخی کو وضاحت چاہی، تو اس نے کچھ یوں کہا: اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور نے عطاء الحق قاسمی کے اعزاز میں ایک شعری نشست کا اہتمام کیا تھا۔ یونیورسٹی اپنے مشاعروں میں اساتذہ، زیرِ تعلیم طلباء اور فارغ التحصیل طلباء ہی کو مدعو کرتی ہے مگر اس مشاعرے میں خصوصی طور پر ظہور آثم کو بلایا گیا تھا۔ پروفیسر ڈاکٹر شفیق احمد آتش نے وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر محمد مختار کو ظہور آثم کی ادبی خدمات سے آگاہ کرتے ہوئے عطاء الحق قاسمی سے مالی امداد کی سفارش کرنے کی اپیل کی تھی۔ قاسمی صاحب! اس وقت پنجاب آرٹ کونسل کے ڈائریکٹر تھے اور خادم اعلیٰ میاں شہباز شریف کے مشیر اعلیٰ بھی تھے۔ مشاعرے کے بعد مذکورہ شخصیات نے قاسمی صاحب سے ظہور آثم کا تعارف کرایا اس کی ادبی خدمات کا تذکرہ بھی کیا اور اس کی معاشی ابتری کے حوالے سے مالی امداد کی سفارش کی۔ قاسمی نے کہا۔ درخواست کے ساتھ مطبوعہ کلام کی دس کاپیاں بھیج دو۔ مالی امداد ظہور آثم کا حق اور میرا فرض ہے مگر لاہور کی رنگین فضاؤں میں حق اور فرض اپنی معنویت کھو دیتے ہیں۔ ظہور آثم سے کیا ہوا وعدہ بھی لاہور کی رنگین فضا، تحلیل ہو گیا اور شفیق آتش یاددہانی کراتے رہ گئے۔

سید قاسم جلال کو دیکھ کر ہمیں کراچی کے معروف ادیب و شاعر، ممتاز ناقد پر اسرار کہانیوں کے خالق شمیم نوید آباد آ جاتے ہیں۔ ایک بار تنقیدی اجلاس میں کسی نوجوان شاعر نے ان کی غزل پر بے تکا اور بے جواز اعتراض کیا، جسے دیگر ناقدین نے مسترد کر دیا تھا۔ اجلاس کے بعد نوید بھائی نے نوجوان شاعر سے کہا۔ اپنے سینئر پر اعتراض کرنے سے پہلے اپنی قد و قامت پر غور کر لیا کرو۔ میری مطبوعہ کتب کی تعداد تمہاری عمر سے زیادہ ہے اور اگر اپنے مطبوعہ مضامین، شاعری، کہانیوں اور ناولوں کو تمہارے سر پر رکھ دوں تو تمہاری گردن ٹوٹ جائے گی۔ سید قاسم

جلال نے بھی اتنا لکھا ہے کہ اگر اسے کسی کے سر پر رکھ دیا جاتا تو اس کی گردن کا ٹوٹنا ایک یقینی امر ہے۔

چھوٹی بحر بڑی غزل

خاکہ

نوشی گیلانی

ناصر حسنی

ماہرین حسن کی رائے کے مطابق مردوں میں ایسی خواتین بہت مقبول ہوتی ہیں جن کا سائز 36،23،36 ہو مگر نوشی گیلانی کا نہ تو قد ہے اور نہ ہی ڈیل ڈول بس کشش کا ایک ڈول ہے جو لوگوں کو اپنی جانب کھینچ لیتا ہے وہ اتنی دھان پان ہے کہ دوسروں کے کاندھوں پر سوار ہو کر بھی بلند قامت نہیں ہوسکتی۔ ویسے بھی لم ڈھینگ کہلانا اس کو پسند نہیں وہ تو صرف سر بلند رہنا چاہتی ہے جہاں تک اس کی اونچی ایڑی والی جوتی کا تعلق ہے تو یہ ایک ایسا ہتھیار ہے جس کا نہ لائسنس ہے اور نہ ہی تعزیرات پاکستان کے تحت کوئی جرم ہے یوں بھی ہمارے ہاں قد و قامت کون دیکھتا ہے سبھی سائے کی پیمائش کے ماہر ہیں۔

نوشی گیلانی بہاول پور کے ادبی جریدے ''سائبان'' کی مدیرہ ہیں، کہتے ہیں وہ بہت اچھی شاعرہ ہے اگر اس کی آواز ریگزار بہاول پور کی بجائے ادب کے کسی دوسرے ایوان سے گونجتی تو وہ ملک گیر شہرت کی مالک ہوتی۔ ویسے بھی صحرا میں آدمی اپنی بازگشت ہی سن سکتا ہے جہاں تک اس کی شاعری کا تعلق ہے ہم اس پر کوئی حتمی فیصلہ ٹھونسنے سے قاصر ہیں کہ فن شاعری باذوق سامع سے زیادہ اہل فن کی طلبگار ہوتی ہے۔ البتہ ہم اس کو مشاعروں کی پھولن دیوی پورے یقین سے کہہ سکتے ہیں اب یہ ایک بات ہے کہ وہ بحر خفیف کی طرح اتنی نرم و نازک ہے کہ واقعی پھولن دیوی ہی لگتی ہے۔

مشاعرہ لوٹنے میں اتنی مشاق ہے کہ بڑے بڑے جغادری شعراء جنہوں نے ساری عمر اسی دشت کی سیاحت کی ہے اپنے بال نوچ نوچ کر ''گنجے پن'' میں مبتلا ہو چکے ہیں وقار عزیز صدیقی تو جب بھی اس کی تازہ غزل سنتے ہیں باقاعدہ طور پر ''یہ کیا کہہ دیا'' کی گردان رٹتے

ہوئے اپنے بال نوچنے لگتے ہیں۔ان کا ''شورزدہ سر'' ہماری بات کا عینی شاہد ہے۔

وہ افسانے بھی لکھتی ہے مگر یہاں ہم اپنے رائے محفوظ بلکہ حنوط رکھتے ہیں کہ اس معاملہ میں کوئی اس سے حسد کرسکتا ہے اور نہ ہی رشک نوشی حسب نسب کے لحاظ سے حسنی ہے مگر اپنے آباؤ اجداد کے شہر کی نسبت سے خود کو گیلانی کہلواتی ہے شاید گیلانیوں کی امارت سے مرعوب ہے۔شکل صورت کی اجلی تو نہیں مگر خاصی نکھری نکھری دکھائی دیتی ہے،شنید ہے کہ ایک بار کسی صاحب نے کشورناہید کو ''اجلی'' کہہ دیا تھا اب تک وہ اپنے گال کو سہلاتے رہتے ہیں،دروغ برگردن راوی۔

ادیب اور خطیب کو پختہ کار ہونا چاہیے کردار اور عمر کا پختہ ہونا تو تعلقات عامہ کا مسئلہ ہے اور یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا حل نوشی گیلانی ایسے شعراء کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

زبان کو بعض لوگ اپنے گھر کی لونڈی سمجھتے ہیں مگر یہ لونڈی ہمیشہ کسی استاد کی دین ہوتی ہے۔جبکہ شہرت کی لونڈی نصیبوں کا کھیل ہے اور نوشی ان خوش نصیبوں میں شامل ہے جو منظر پہ آتے ہی پورے ماحول پر چھا جاتے ہیں۔

کسی شخص کے بڑے ہونے کی ایک بڑی دلیل یہ بھی ہے کہ اس کی شخصیت متنازعہ ہوتی ہے اس کی سوچ اس کے افکار لوگوں کو اس طرح دو حصوں میں بانٹ دیتے ہیں۔جس طرح عصائے موسیٰ نے دریائے نیل کو دو ٹکڑوں میں منقسم کر دیا تھا اس کا ایک شعر تو مدتوں ہوٹلوں اور غیر ادبی محفلوں میں موضوع سخن رہا ہے اختلاف والوں کا خیال ہے کہ اس شعر میں ''محبوب کو'' بدماغ کہہ کر ''بدقماش'' کہا گیا ہے جبکہ دوسرے فریق کی رائے میں ہوٹل پردیس کی علامت ہے یہی وجہ ہے کہ اس شعر میں جدیدیت سے زیادہ شعریت کا عنصر پایا جاتا ہے۔

نوشی نے جونہی دشت غزل میں قدم رکھا اس کے پاؤں بوجھل ہو گئے مگر آگاہ مارنے کی خاصیت نے اس کا پیچھا خاصا بھاری کر دیا ہے اور اب وہ اہل قلم کانفرنس کی مستقل مندوب ہے کچھ لوگ اکتساب والے ہیں اور کچھ اختلاف والے ہیں دونوں میں تو تو،میں،میں ہوتی رہتی ہے اور میں،میں کی صدا ہمیشہ بھاری رہتی ہے،یقین نہ ہو تو ایک عدد بکری پال کر دیکھ لیجئے۔

نوشی گیلانی کے سرپرست منور جمیل قریشی کے تعلقات کسی زمانے میں سلیم شہزاد سے بہت اچھے ہوا کرتے تھے۔ ایک روز جب منور جمیل قریشی نے سلیم شہزاد کی کھوں کھوں سے تنگ آ کر کہا:

یار! تم یہ سگریٹ ''نوشی'' چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟؟؟

میں سگریٹ چھوڑ سکتا ہو مگر؟؟

مگر کیا؟ قریشی صاحب نے اپنی آنکھوں کی کشادگی میں مزید اضافہ کرتے ہوئے کہا:

یہ کہ تم نوشی کو چھوڑ دو۔

سلیم شہزاد نے سگریٹ چھوڑی اور نہ منور جمیل قریشی نے نوشی کو چھوڑا۔

مگر دو دوستوں نے ایک دوسرے کو چھوڑ دیا۔

نوشی کچھ عرصہ انفارمیشن کے شعبہ سے منسلک رہی ہے مگر اپنی ناتجربہ کاری کے سبب یہاں پر اپنا داخلہ ممنوع کرا بیٹھی۔ وہ کاغذ کی بساط پر لفظوں کے مہرے جمانے کا ہنر تو جانتی ہے مگر ابھی شاطرانہ چالوں سے کچھ زیادہ آگاہی نہیں رکھتی۔ بہرحال وقت بہت بڑا استاد ہے اور بالآخر ایک دن وہ اس فن میں بھی مہارت حاصل کر لے گی۔

سخن پرور

خاکہ

خورشید ناظر

ناصر حسنی

گورا رنگ جو کبھی گوریوں سے زیادہ پرکشش ہوا کرتا تھا، زمانے کے نشیب و فراز نے تھوڑا ماند کر دیا ہے، متناسب قد و قامد مگر فکری اعتبار سے اتنے بلند قامد ہیں کہ عالم چنّا جیسے کیم شیم اور قد آور بھی چھوٹے دکھائی دیتے ہیں، گوری چٹی رنگت اور نیلی آنکھیں دیکھ کر پٹھان ہونے کا گمان ہوتا ہے، مگر حسب اور نسب کے اعتبار سے ملک ہیں سخن فہمی کا یہ عالم ہے کہ جس پر تنقید کی وہ پائمال چشم کبود ہوں کا ورد کرتا رہتا ہے روشن آنکھیں جو ذہانت کی عکاس ہیں، کشادہ پیشانی، بلند اقبالی کا اشتہار ہے مگر یہ محترم اشتہاری ہیں نہ اقبالی، ایک دن کہنے لگے تم اور جمیل اختر بہت اچھے افسانچہ نگار ہو مگر عنوان کے معاملے میں سخت نالائق ہو ہم نے کہا کہ آئندہ ہفتے ہم اپنا افسانچہ پیش کریں گے، جسے سن کر ناقدین اور سامعین کے ہوش اڑ جائیں گے، عنوان کے بارے میں پوچھا تو ہم نے کہا کہ ''کر کمی ناتا'' کہنے لگے کسی عورت کو ناجائز بچے کی ماں دکھایا ہوگا، موضوع تو یہ نا تھا مگر مماثلت ضرور پائی جاتی تھی، معاملہ کچھ ایسا ہے آپکی ماسٹر کی نے افسانچے کے کلید تک رسائی حاصل کر لی ہے، مگر حقیقت یہ بھی ہے کہ افسانچہ ناقدین کے سروں پر سے گزر جائے گا، ایک قہقہہ لگایا اور کہا اپنے قارئین کو بے وقوف سمجھنے کی حماقت میں مبتلا رہے تو کبھی اچھی تحریر نہ لکھ سکو گے۔

بی اے کے بعد کراچی چلے گئے وہاں پر انگریزی افسانوں کا اردو میں ترجمہ کرنے لگے مگر جب ترجمہ پر طبع زاد ہونے کا گمان ہونے لگا تو خیر سے بہاول پور لوٹ آئے اور خاندانی منصوبہ بندی کے محکمہ سے وابستہ ہو گئے اور اہل وطن کو باور کرانے میں جٹ گئے کہ بچے دو ہی اچھے، سننے والوں پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا بلکہ وہ یہ سمجھانے لگے کہ بیویاں دو ہی اچھی تو ''چشم کبوذ'' میں سرخ سرخ ڈورے دوڑنے لگے جنہیں انکی دیانتداری اور اہلیہ محترمہ کے احترام میں وفاداری بشرط استواری

کا ورد کرنے لگے خورشید ناظر کو دیکھ کر تخلیق کاروں کے دانتوں میں پسینہ آنے لگتا ہے مگر جب یہ حضرت گھر جاتے ہیں تو سبز الا یچی کو دانتوں میں دبانا کبھی نہیں بھولتے ،ایک بار انکی جدید غزل سن کر پروفیسر عابد صدیق نے کہا بھائی میاں کبھی ہمیں بھی سانس لیتی ہوئی دیوار پر آنکھوں کا ہجوم دکھانا ،خورشید ناظر بھلا کب چوکنے والے تھے تُرنت کہا جس دن تم دیواروں کے کان دکھا دو گے میں دیوار پر آنکھوں کا ہجوم دکھا دونگا۔

خورشید ناظر کا شمار پڑھے لکھے لوگوں میں ہوتا ہے،انہوں نے ڈگری کے ساتھ تعلیم بھی حاصل کی ہے ہم پورے یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ بہاول پور میں ان جیسا سخن فہم سخن شناس اور سخن پرور بہت کم ہونگے ،اتنے کم کہ انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں مگران میں کوئی انگلی ایمپائر کی نہیں ہوگی ،لفظوں کا ظاہر تو سب پر ظاہر ہوتا ہے مگر ان کے باطن میں جھانکنے کا ہنر کوئی کوئی جانتا ہے،خورشید ناظر اس فن میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں، سنا ہے یہ سارا کمال سایہ طوبیٰ کا ہے،اسّی کی دہائی میں بہاول پور ادبی طور پر بہت فعال اور متحرک تھا درجنوں ادبی محافل میں ہفت روزہ اجلاس ہوا کرتے تھے اردو مجلس اور قلم قبیلہ کے ادبی اجلاس اور مشاعرے بے نظیر ہوا کرتے تھے،قلم قبیلے میں بے نظیریوں کی اکثریت تھی مگر سبھی کے پاؤں میں جوتے ہوا کرتے تھے، اردو مجلس کے اجلاس میں ادبی ڈاکٹر زیادہ ہوا کرتے تھے ایک اجلاس میں کسی پروفیسر نے تنقید کیلئے افسانچہ پیش کیا خورشید ناظر نے بحث کا آغاز کرتے ہوئے کہا زیر بحث تحریر افسانچے کی تعریف پر پوری نہیں اترتی اسے واقعہ کہہ سکتے ہیں اور واقعہ بیان کرنے کیلئے کسی خاص اسلوب کی ضرورت نہیں ہوتی بس اپنے لفظوں میں بیان کرنا ہی کافی ہوتا ہے، یہ جمالیاتی عنصر سے بھی عاری ہوتا ہے مگر صحافتی اسلوب پر بھی پورا نہیں اترتا،افسانہ بنت،ہیّت اور اسلوب کے اعتبار سے مکمل اور بھرپور کہانی کا حامل ہوتا ہے،لفظوں کی کشید اور اختصار کا ہنر افسانچے کی شناخت ہے،پہلی بار ہم نے اپنا افسانچہ ''اوور ٹائم'' تنقید کیلئے پیش کیا جسے بھرپور پزیرائی ملی ،خورشید ناظر نے بہت سراہا اور یوں ہم نے شاعری اور افسانے سے ترک تعلق کر کے افسانچے پر قناعت کر لی اللہ اور اسکے عاقل و بالغ بندوں کو ہماری قناعت اور فکری

بلاغت بہت پسند آئی بعض اوقات ہمارے افسانچے سامعین اور ناقدین کے سروں پر سے کسی جنگی طیارے کی طرح گزر جاتے، ایسے موقع پر خورشید ناظر اپنی موجودگی کا احساس دلاتے، افسانچے کے باطن میں چھپے مفہوم کو سامنے لاتے۔محترم خورشید ناظر کہا کرتے تھے، بچے! بد دل مت ہونا تعلیمی اسناد اور سخن فہمی دو الگ الگ معاملات ہیں، مختلف کیفیات ہیں، انہوں نے پیشنگوئی کی تھی کہ ہمارے افسانچوں پر تھیسز لکھے جائیں گے، ہماری محنت اور انکی پیشنگوئی رائیگاں نہ گئی، اب ہمارے افسانچوں، خاکوں اور ادبی کالموں پر ایم فِل کیئے جا رہے ہیں۔

خاندانی منصوبہ بندی نے ملازم دو ہی اچھے پر عملدر آمد کی ٹھانی تو انکی اور قاسم رشید فاروقی کی محکمہ سے ٹھن گئی، یوں دونوں حضرات بے روزگاری کی بھینٹ چڑھا دئے گئے بے روزگاری کے باعث فاقہ مستی سے بچنے کیلئے ایک دونی دونی کا پہاڑا پڑھانے کا تہیہ کر لیا اور ایک پرائیویٹ اسکول کی بنیاد رکھی جس نے انکی بنیادوں کو خاصا مضبوط کر دیا۔

ظہور آثم کی معاونت سے ایک ادبی رسالے کی ابتداء کی مگر ادبی دنیا کے رسالدار نہ بن سکے، غیر منقوط شاعری کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے مگر عشق کامل ہو تو شاعر کا قلم تیشہء فرہاد کیلئے باعث رشک بن جاتا ہے، بہاول پور میں غیر منقوط شاعری کی ابتداء پنجابی شاعر نذر حسین آزاد نے کی تھی، اردو میں غیر منقوط شاعری کی بنیاد ڈاکٹر نصرت جعفری نے رکھی تھی مگر آثار قرائین بتاتے ہیں کہ مذکورہ شعراء نے اقلیم سخن میں اپنی دھاک بٹھانے کیلئے غیر منقوط شاعری کی تھی۔ ویسے بہاول پور کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ غیر منقوط شاعری کی بنیاد رحیم یار خان کے ایک شاعر نے رکھی تھی جو مغل اعظم اکبر بادشاہ کے نورتنوں میں شامل تھے۔ غالباً انکا نام ۔۔۔۔۔۔۔۔۔شہر ظہور نظر قلب پاکستان کے ایک اہم شاعر تابش الوری بھی ہیں، جنہوں نے اپنی عقیدت کا اظہار کرنے کیلئے غیر منقوط شاعری کو وسیلہ بنایا ان کی قدر کلامی سے متاثر ہو کر حکومت نے تمغہ امتیاز سے نوازا ہم حاسدین کی اس بات سے قطعاً متفق نہیں کہ تمغہ امتیاز کمتر درجے کا تمغہ ہے تمغہ تو تمغہ ہی ہوتا ہے جیسے بادشاہ بادشاہ ہی ہوتا ہے، ہم ایسے بہت سے لوگوں کو جانتے ہیں جو شہادت کا

رتبہ نا پا کر بھی بہت خوش ہیں، کیونکہ انکے سینے پر تمغہ جنگ آویزاں ہے جو انکے غازی ہونے کا بانگ دہل اعلان کر رہا ہے اور کئی غازی ایسے بھی ہیں، جو جنگ کے دوران بیگمات اور صاحبزادگان کے کپڑے دھوتے رہے، محترم خورشید ناظر کے ایک مرید باصفا کا کہنا ہے کہ علامہ اقبال نے

جہاں میں اہل ایماں صورت خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

خورشید ناظر جیسی ہمہ جہت اور ہمہ اوصاف شخصیت کیلئے ہی کہا ہوگا مگر ہم اس رائے زنی کو رائے زن سمجھتے ہیں، کیونکہ خورشید ناظر حرف و معنی کے سمندر کے ماہر تیراک ہیں، انہوں نے ڈوبنا سیکھا ہی نہیں ابھرتے ہی رہتے ہیں، خورشید ناظر نے پانچ درسی کتب اور ایک کتاب خواجہ فرید کی قوافی کا جائزہ اور دوسری کتاب کلام فرید اور مغرب کے تنقیدی روئے تحریر کی، ان کی مؤخر الذکر کتاب پر اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کی جانب سے صد سالہ خواجہ فرید ایوارڈ سے نوازا گیا ہے چار نعتیہ کتب اور تین حمدیہ کتب زیر طباعت ہیں انکی تازہ نعتیہ کتاب ''واللہ الحمد'' جو غالباً غیر منقوط شاعری کی سب سے ضخیم کتاب ہے۔

علم الکلام میں غیر منقوط کلام کا کیا مقام ہے، اس کا تعین ممکن نہیں کیونکہ اسم اعظم بھی غیر منقوط ہے، مختلف موضوعات پر مضامین کالم اور شعری اثاثہ اتنا زیادہ ہے کہ گنتے گنتے منہ خشک ہو جائے۔ سو اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ موصوف کی تخلیقات کا وزن انکے اپنے وزن سے کئی گنا زیادہ ہے بلکہ بہت ہی زیادہ ہے۔

گفتہ نا گفتہ

خاکہ: شگفتہ الطاف

شگفتہ الطاف میرے شہر کی نیک نام اور خوش کلام شاعرہ ہے اہل کتاب ہے صاحب کتاب ہے چہرہ بھی کتابی ہے گویا سراپا کتاب ہے پیشانی کشادہ ہے رنگت سنہری ہے جو کبھی شہابی رہی ہوگی ذہانت سے معمور بادامی آنکھیں اور بھنویں کمان کی طرح ہیں کہتے ہیں یہ سارا جمال اور کمال بیوٹی پارلر کا ہے ہم اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے ہماری جان پہچان صرف دعا سلام تک ہے سو اس کی شگفتگی اور لطافت کے جوہر نہیں کھلے یہ کہنا مشکل ہے کہ شگفتہ زیادہ ہے یا الطاف۔
حکیم محمد سعید کا کہنا ہے کہ دانتوں کا قدرتی رنگ پیلاہٹ مائل ہوتا ہے مگر عوام کی نظروں میں دانتوں کو موتیوں کی طرح سفید اور چمکدار ہونا چاہیے دانت تو شگفتہ کے بھی سفید اور چمکدار ہیں گویا عوام کی تعریف حسن پر پورا اترتی ہے بولتی ہے تو پھول نہیں جھڑتے کرنیں بکھرتی ہیں ماحول اجلا اجلا ہو جاتا ہے قد بوٹا سا ہے نہ قامت چھوٹی سی ہے مگر نظروں کو نوازنے کا فریضہ خوش اصلوبی سے ادا کرتی ہے شکل وصورت سے اتنی سنجیدہ دکھائی دیتی ہے کہ دیکھنے والا دوسری بار دیکھنے کی تمنا ہی کر سکتا ہے قد وقامت عادات واطوار کی مناسبت سے اس کے ہاتھ خاصے کشادہ ہیں مگر یہ کشادگی قانون کے ہاتھوں کی لمبائی سے خاصی مماثلت رکھتی ہے قانون کے ہاتھوں کی پکڑ میں شاذ ونادر ہی کوئی آتا ہے اس کے ہاتھوں کی پکڑ میں تو اپنی کتاب بھی نہیں آتی اسی لیے تو ہاتھوں ہاتھ نکلنے کی سعادت سے محروم رہی

شگفتہ الطاف کی خوش اخلاقی اور خوش کلامی پر اعتراض کرنے والوں کی کمی نہیں اس نے ایک شعر میں زہر کے ذائقے کو شک جیسا قرار دیا ہے اعتراض کرنے والوں کا کہنا ہے کہ شک کے ہزار ذائقے ہوتے ہیں سو یہ کہنا کہ زہر کا ذائقہ شک جیسا ہوتا ہے بات کو مزید الجھا دیتا ہے بات الجھ جائے تو بات بنائے نہیں بنتی باتیں بنانے کی بات اور ہے بات الجھ جائے تو بتنگڑ بن جاتی ہے جو عموماً فساد کا باعث بنتی ہے ٹیچنگ کے شعبے سے تعلق ہے سنا ہے پچ بٹن نہیں لگا سکتی مگر ہم سنی

سنائی باتوں پر یقین نہیں رکھتے البتہ اس شنید پر پورا یقین رکھتے ہیں کہ چلتی ہے تو صبا ٹھہر کے دیکھتی ہے اگر یہ بات ہے تو ہم بھی ٹھہر کے دیکھتے ہیں بس خدشہ یہ ہے کہ ہم ٹھیرے پختون سید جہاں ٹھیرے تھیر گئے مگر یہ ٹھیرنے کا موقع نہیں چلتے رہنا ہی غنیمت ہے جو معاملہ غنیمت ہو اس میں عافیت کے ہزار پہلو نکلتے ہیں

نوشی گیلانی بہاولپور کی ایک بلند آواز ہے ان دنوں کوہساروں میں گونج رہی ہے اسے چھوٹی بحر کی بڑی غزل کہا جاتا ہے مگر شگفتہ کے ذوق بحر میں ساری بحریں موج زن رہتی ہیں وہ چھوٹی بڑی کے جھنجٹ میں نہیں پڑتی کہ بعض اوقات چھوٹی بڑا فتنہ ثابت ہوتی ہے سننے میں آیا ہے کہ ایک بار کسی ناقد نے اسے شاعری کی بساط کا بڑا کھلاڑی قرار دیا تو اس نے بڑی شگفتگی سے کہا مجھے شاطر کہلانا بالکل پسند نہیں بات تو سولہ آنے درست ہے مگر سولہ آنے کا دور گزر چکا ہے اور گزرے ہوؤں کو یاد کی حد تک ہی محدود رکھنا چاہیے خاتون عام ہو یا خاص بندوق چلانے کے لیے دوسروں کا کندھا ڈھونڈتی ہے مگر شگفتہ کسی کے کاندھے پر بندوق رکھتی ہے نہ کسی کے کاندھے پر سوار ہو کر اپنا قد بڑھانے کی شوقین ہے کہ شوق کا کوئی مل نہیں ہوتا اور وہ مول تول کے قائل ہی نہیں مشاہدے کے مطابق وہ سنانے سے زیادہ سننے کا شوق رکھتی ہے سو ادبی محفلوں میں کم کم دکھائی دیتی ہے کہ وہاں سننے کے بعد سنانا بھی پڑتا ہے قد وقامت کے اعتبار سے ہاتھوں کی لمبائی مناسب ہے مگر کسی پہ دست درازی کرتی ہے نہ ہاتھ دراز کرتی ہے مسکراہٹ کی حد تک خاصی سخی ہے مگر کتاب کے معاملے میں بخیل ہے اپنی کتاب بھی کسی کو نہیں دیتی جو لوگ زہر کے ذائقے کو شک جیسا کہنے پر معترض ہیں وہ خوبانی کی گری کے بارے میں کچھ نہیں جانتے یوں بھی زہر کے ذائقے کو شک جیسا کہنا قابل اعتراض نہیں کہ زہر جان لیوا ہوتا ہے اور شک جان گسل ہوتا ہے زہر فوری موت کا باعث بنتا ہے اور شک تڑپا تڑپا کر مارتا ہے

شگفتہ کی طرح سائنس دان بھی زہر کے ذائقے کے بارے میں بھی شک میں مبتلا تھے وہ اتنا ہی جانتے تھے کہ سائینا ئیڈ انتہائی مہلک زہر ہے مگر اس کے ذائقے سے واقف نہیں تھے وہ

جاننا چاہتے تھے کہ اس کا ذائقہ کڑوا ہے میٹھا ہے نمکین ہے کھٹا ہے یا کسیلا ہے ایک بوڑھے سائنس دان نے جس کے پاؤں قبر میں لٹکے ہوئے تھے ہاتھ میں قلم پکڑا سامنے کاغذ رکھا اور سائینائیڈ کو زبان سے لگایا مگر قلم کی حرکت سے قبل اس کے قلب کی حرکت بند ہوگئی ایک نئی تحقیق کے مطابق خوبانی کی گری میں امیگد رالین پایا جاتا ہے گری چبانے سے ہائیڈروسائینائیڈ پیدا گیس پیدا ہوتی ہے جس سے فوری موت واقع پیدا ہوسکتی ہے گویا یہ کہا جاسکتا ہے کہ زہر کا ذائقہ شک سے ماورا نہیں شگفتہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ مغرور ہے تکبر کی پوٹلی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک انتہائی سنجیدہ خاتون ہے مردوں سے فاصلہ رکھنے کی قائل ہے زیادہ گھلنا ملنا اس کے نزدیک اخلاقی کرونا کو دعوت دینے کے مترادف ہے اس کے یہ انداز دوسروں سے منفرد کرتے ہیں جسے تکبر کا نام دیا جاتا ہے اگر کوئی اسے مغرور سمجھتا ہے تو یہ اس کی کم عقلی ہے اور المیہ یہی ہے کہ ہمارے ہاں کم عقلوں کی بہتات ہے۔

میٹھا سُر

خاکہ

پروفیسر ڈاکٹر نواز کاوش

ناصر حسنی

سنا ہے بعض لڑکیاں با جمال اور کمال ہوتی ہیں کہ بولتی ہیں تو پھول جھڑتے ہیں ممکن ہے ایسا ہی ہو کہ زندگی کے کسی معاملے میں امکانات کو مسترد نہیں کیا جا سکتا البتہ ہماری ملاقات کبھی ایسی لڑکی سے نہ ہوسکی جو مسکراتی ہو تو پھول جھڑتے ہوں۔ ہاں، بال جھڑتے ہوئے دیکھے ہیں لڑکیاں با جمال ہوتی ہیں اس حقیقت سے انکار ممکن ہی نہیں کہ لڑکی کے معنی ہی با جمال ہیں۔کوئی کوئی لڑکی با کمال بھی ہوتی ہے اور کمال کی چیز ہوتی ہے۔ چیز پر یاد آیا۔ہم نے ایک لڑکی کے کمالات سے تنگ آ کر کہا:

''تم کیا چیز ہو۔'' سخت ناراض ہوئی، ایک دم پارہ چڑھ گیا اور کہنے لگی:

''تم مجھے چیز سمجھتے ہو۔'' ہم نے فوراً سے پیشتر معذرت کی اور اظہار شرمندگی کی ساری کیفیات خود پر طاری کرتے ہوئے کہا۔

''چیز تو ہم ہیں۔ آپ تو ناچیز ہیں۔'' پھول تو نہ جھڑے مسکراہٹ جھڑنے لگی۔''تم بہت وہ ہو جی'' کہہ کر ہماری نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ ہاں یاد آیا۔ ہماری ملاقاتیں ایسے نوجوان سے ہوتی تھی جو بولتا تو کلیاں چٹکی تھیں۔ ماحول کتنا ہی ناخوشگوار کیوں نہ ہوتا ایک عجیب سی خوشگواریت طاری ہوجاتی تھی۔کلیاں بھی چٹکتی تھیں۔ پھول بھی جھڑتے ہیں۔اس نوجوان کا نام نواز کاوش تھا جو عملی زندگی میں پروفیسر نواز کاوش کے نام سے مشہور و معروف ہوا۔ہم پروفیسر کو اسم با مسمیٰ بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ نواز کاوش تحریر اس کی ہو یا اس کے کسی عزیز دوست کی نوازنے کا حق ادا کر دیا کرتا تھا۔'' سنا ہے اب بھی ایسا ہی کرتا ہے۔بھرا ہوا جسم مناسب قد و قامت، سانولا رنگ، شربتی آنکھیں، لب کھولے تو کلیاں چٹکیں یہ تھا سراپا نوجواں نواز کاوش کا اس وقت غالباً ایم اے کا

طالب علم تھا ریڈیو پروگرام کرتا، ادبی محفل قلم قبیلہ میں قلم کے جوہر دکھاتا تھا۔ پروفیسر نواز کاوش سے مراسم کا عرصہ ادبی زندگی جتنا ہی ہے گویا یہ نصف صدی کا قصہ ہے۔ پہلی ملاقات بڑے دلچسپ حالات میں ہوئی، جب اس ملاقات کی یاد آتی ہے لبوں پر مسکراہٹ کھلنے لگتی ہے۔ ہوا یوں کہ قلم قبیلہ کے اجلاس میں ہم نے افسانہ سنانا تھا۔ کسی محفل میں افسانہ سنانے کا یہ پہلا موقع تھا۔ عجیب سی گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ بے وقت کی پیاس ستا رہی تھی۔ گلا خشک ہو رہا تھا۔ بار بار لبوں پر زبان پھیر رہے تھے۔ روزنامہ مغربی پاکستان کے خوش نویس رئیس احمد اور نوجوان شاعر ظہور آثم ہماری کیفیت سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ پریس کلب جہاں اجلاس ہو رہا تھا اس کے قریب پہنچے تو رئیس احمد نے کہا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں افسانے پر نظریں جما کر پڑھنا کسی اور جانب توجہ مت دینا، سوچ لینا سب مٹی کے مادھو ہیں سوان پر مٹی پا دینا۔ (خدا خدا کر کے ہم کمرہ اجلاس میں پہنچے تو کوئی اور صاحب افسانہ سنا رہے تھے۔ یہ منظر دیکھتے ہی پختون خون نے جوش مارا۔ جلال سادات نے بھی اپنا اظہار ضروری سمجھا اور ہم اہل بزم پر برس پڑے۔ پروگرام اور اخباری اطلاع کے مطابق افسانہ ہم نے سنانا تھا۔ تم لیٹ آئے ہو۔ منور جمیل قریشی نے وضاحت کی۔ یہ حضرت افسانہ بغل میں دبائے پھر رہے تھے اور نعرہ زن تھے کہ افسانہ سنو، بھئی افسانہ سنو۔ صورتحال سنبھالنے کیلئے ایک پرکشش نوجوان اٹھا جو ہمیں باہر لا کر کہنے لگا۔ حسنی صاحب وہ پروفیسر ہیں بہاولنگر سے تشریف لائے ہیں۔ ہمارے بارے میں کیا سوچیں گے۔ ہماری مشکل یہ ہے کہ وہ بھی تمہاری طرح مہمان ہیں۔ اچھا یہ بتاؤ کرتے کیا ہو۔ رینجرز میں حوالدار ہوں۔ آئندہ حوالدار کو رینجرز کے گیٹ پر چھوڑ کر آنا۔ اور ہاں اگلے ہفتے آپ ہی افسانہ سنائیں گے۔ پلیز! وقت پر آ جانا۔ اس گبرو نوجوان کا لہجہ بڑا متاثر کن تھا۔ لگتا تھا کلیاں چٹک رہی ہیں۔ پھول کھل رہے ہیں۔ سارا ماحول ہی معطر ہو گیا تھا۔ اجلاس میں آ کر ہم اس کے لب و لہجے پر سوچتے رہے اور تمام عمر اس کے لب و لہجے کی پیروی کرنے کی کوشش کرتے رہے مگر کامیاب نہ ہوئے۔ آواز میں مدوجذر اور لہجے میں ٹھہراؤ اللہ کی دین ہے۔ جس کی ہمیں توفیق نہ ملی۔

دِل دِل پاکستان

خاکہ

انجینئر چوہدری جمیل

ناصر حسنی

گول چہرہ ستواں ناک بھرا بھرا جسم، جاذب نظر خدوخال لمبا قد، چوڑا سینہ، گندمی رنگ جو جوانی میں یقیناً گوراچٹا رہا ہوگا روشن چمکدار آنکھیں جو ستاروں کی طرح جگمگاتی رہتی ہیں، دماغ کنیڈین دل پاکستانی ہے، چہرہ کتابی ہے خود صاحب کتاب ہیں، ہم نے ایک پروفیسر کو صاحب کتاب ہونے پر مبارکباد دی ہماری اس جرأت رندانہ پر موصوف کو غصے کا ایسا نشہ چڑھا کہ ہم پر چڑھائی کردی وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ ہم نے اہل کتاب کہہ کر کیا کہنے کی کوشش کی ہے، عیسائی اور یہودی بھی اہل کتاب کہلاتے ہیں، محترم خورشید ناظر اور دیگر دوستوں نے بہت سمجھانے کی کوشش کی مگر موصوف سمجھنے پر آمادہ ہی نہیں تھے، ان کی دماغ کی سوئی اس موقف پر اٹک گئی تھی کہ معذرت کی جائے، دوستوں نے کہا معذرت کرلو تاکہ یہ ہنگامہ آرائی ختم ہو اور انجمن آرائی کا آغاز کیا جائے، ہم نے کہا کہ پروفیسر صاحب یہ تسلیم کرلیں کہ وہ اہل کتاب نہیں تو ہم ناک رگڑنے اور پاؤں پکڑنے میں بھی کوئی عار محسوس نہیں کریں گے، ہماری اس شرط نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور نومن تیل کے بغیر ہی رادھا ناچنے لگی، خدا خدا کر کے تھکن کے آثار ظاہر ہوئے تو دوستوں نے صفائی کے بغیر ہی صلح کرادی۔ چوہدری صاحب اپنے قد کی مناسبت سے لمبی لمبی غزلیں کہتے ہیں، عروض میں دسترس رکھتے ہیں مگر شاگردوں کی دسترس سے دور ہیں، اس دوری کو ''ادبی کورونا'' سے تحفظ بھی کہا جاسکتا ہے، استاد شعراء دیدہ دانستہ بیس پچیس اشعار کی غزلیں کہا کرتے تھے اور پھر اپنے لئے پانچ یا سات اشعار رکھ کر بقیہ شاگردوں میں بانٹ دیا کرتے تھے، کئی دہائیوں قبل بہاول پور میں بھی ایسے شعراء موجود تھے جو اصلاح کی بجائے غزل دان کرنا مناسب سمجھتے تھے ہم نے ایک بزرگ شاعر سے اس سخاوت کی وجہ پوچھی تو کہا کہ بے وزن غزل کی اصلاح کرنے سے بہتر ہے کہ چند اشعار دان کردئے جائیں، بھلے وقتوں میں ادبی تخلیق کو اولاد ہی کی طرح پیارا سمجھا جاتا تھا سو اپنا کلام کسی کی جھولی میں ڈالنے کے عمل کو دان سمجھا جاتا تھا اب یہ ایک الگ بات ہے کہ ضرورت پڑنے پر سگریٹ کے ایک پیکٹ پر بھی غزل دان کردی جاتی ہے جسے حوصلہ افزائی کا نام

دیا جاتا ہے۔ایسے دوستوں سے ہم یہی گزارش کیا کرتے ہیں کہ عطیہ لینے والے کے لب و لہجے اور تلفظ پر غور کرلیا کرو ورنہ۔۔۔۔۔۔بدنامی تمہارا ہی مقصوم ٹھیرے گی، جواباً کہا جاتا ہے کہ ناموری کا دوسرا نام بدنامی ہی تو ہے۔

چوہدری صاحب کی نظر میں ان دنوں بہت دلکش اور مترنم غزلیں کہی جارہی ہیں مگر ان میں لفاظی کے سوا کچھ نہیں ہوتا سو شاعری کا زیادہ حصہ ریت کی لکیر ثابت ہورہا ہے، اگرچہ انکی شاعری اس نقص سے پاک ہے پھر بھی انہوں نے اپنے شعری مجموعے کا نام ''لکیریں ریت کی'' رکھا ہے، چوھدری صاحب تاڑ سا قد رکھتے ہیں مگر ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ تاڑنے کی علت میں مبتلا ہیں یا نہیں، سنا ہے تاڑنا شعراء کی فطرت ہوتی ہے، ہمیں حیرت اس بات پر ہے کہ وہ عروض کے ماہر ہونے کے باوجود استاد شعراء میں شامل نہیں، انکی شعری اٹھان بہت اچھی ہے نصف صدی کی مسافت طے کرنے کے بعد بھی تکان کے اثرات نہیں، کہتے ہیں 40 سال کے بعد جسمانی توانائی کے ساتھ ساتھ ذہنی قوت بھی ماند پڑنے لگتی ہے، مگر چوھدری صاحب کی ذہنی صلاحیتیں وقت کے تقاضے کی تابع نہیں آج بھی جوانوں سے زیادہ جوان دکھائی دیتے ہیں بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا، پچ ہتھے گویا پورے آدمی ہیں۔روح کی تسکین کا ذریعہ شاعری ہے اور جسم کی توانائی کا ذریعہ انجینئرنگ ہے لیکن انجیرڈ شاعری نہیں کرتے اردو کے معروف ناقد و شاعر سلیم احمد کا ارشاد ہے، عورت کی طرح شاعری بھی پورا آدمی مانگتی ہے خوشگوار ازدواجی زندگی کیلئے عورت پورے آدمی کی طلب گار ہوتی ہے اسی طرح شاعری بھی خوشگوار احساست اور تاثر کن جذبات کے بیان کیلئے پورا شاعر چاہتی ہے، اس پس منظر میں چوہدری صاحب عورت اور شاعری کیلئے مثالی آدمی ہیں، عروض سے متعلق بہت سی کتب دستیاب ہیں، مگر چوہدری صاحب نے یہاں بھی اپنی انفرادیت برقرار رکھی ہے، عروض پر جو کتاب تحریر کی ہے اس میں عروض کی باریکیاں بڑی باریک بینی سے بیان کی ہیں انہوں نے سلیس اردو عروص لکھ کر فن عروص کو اتنا سہل بنادیا ہے کہ غیر شاعر بھی شاعری کرسکتا ہے، فاعلاتن فاعلات کی پٹڑی پر دوڑنا چہل قدمی کی طرح آسان ہوگیا ہے، عروض کے ماہرین کا کہنا ہے کہ چوھدری صاحب نے فن عروص پر قلم کشائی کرکے ایسی دستاویز پیش کی ہے جو آنے والے زمانے کیلئے یادگار ثابت ہوگی، موصوف کی قابل تحسین کامیابی یہ ہے کہ جو شاعر تنقیدی اجلاسوں میں فن عروض کی عدم واقفیت کے سبب تنقید کا ہدف بنا کرتے تھے اس کتاب کو پڑھ کر اپنی

خامیوں کا تدارک کرنے کے اہل ہو سکتے ہیں، چوھدری صاحب کو احساس تھا کہ بہت سے شاعروں کی جیب بہت ہلکی ہوتی ہے، بارہ سو روپے کی کتاب خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے ایسے شعراء چھ سو روپے ادا کر کے کتاب خرید سکتے ہیں، چوھدری صاحب لکھتے ہیں کہ اردو میں شعر کی کوئی تعریف موجود نہیں، حالانکہ موصوف نے شعر کی جو تعریف بیان کی ہے وہ انتہائی مناسب ہے، کہتے ہیں شعر بنیادی طور پر ایک وجدانی اور نیم الہامی کیفیت میں کہا گیا بیان ہے، عربی میں شعر کی جو تعریف بیان کی گئی ہے وہ یوں ہے، شعر وہ کلام ہے جو کسی وزن پر ہو اور اسے ارادتاً موزوں کیا گیا ہو اور اس میں قافیہ ہو۔ چوھدری صاحب اس تعریف کو انتہائی ناموزوں قرار دیتے ہیں، ان کے خیال میں ارادتاً شعر کہنا لازم نہیں شعر تو اکثر اپنی مکمل صورت میں وارد ہوتا ہے، کبھی کبھی اس کی مرمت بھی کرنا پڑتی ہے، شعر میں قافیہ کی شرط بھی غیر ضروری ہے، صرف غزل کی حد تک درست ہے، بعض اوقات صرف ایک ہی شعر ہوتا ہے اس کا قافیہ کیسے ممکن ہے، اگر چوھدری صاحب کی بات کو تسلیم کر لیا جائے تو آمد اور آورد کا جھنجھٹ ہی ختم ہو جائے گا، پھر اخبارات میں لکھے جانے والے قطعات کی کیا حیثیت ہو گی وہ تو ارادتاً ہی کہے جاتے ہیں۔۔۔تو کیا انہیں شاعری کے دائرے سے خارج کر دیا جائے، اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھنا ہو گا کہ ہر شعری بیان جس میں وزن بھی موجود ہو شاعری نہیں ہوتا جو کلام سلاست روانی اور غنائیت سے عاری ہو اسے شاعری کیونکہ تسلیم کیا جا سکتا ہے، جو کلام موزوں تو ہو مگر غنائیت، سلاست اور روانی سے عاری ہو اسے منظوم کلام کہا جاتا ہے، افسوسناک صورتحال یہی ہے کہ جو کلام مروجہ کسی بحر میں ہو اسے شاعری کہا جاتا ہے، علم عروض کا ہر ماہر خود کو شاعر کہتا ہے مگر شاعری فاعلاتن اور فعلات کا نام نہیں، ردھم سے محروم کلام کو شاعری کہنا بدذوقی کی انتہا ہے من حیث القوم ہم انتہا پسندی کو پسند کرتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اردو میں شاعری کا نہیں کتابوں میں اضافہ ہو رہا ہے ایسے شعراء کو کوئی نہیں جانتا جن کی عمر تیس سال اور کتابوں کی تعداد تیس سے بھی زیادہ ہے، ہمارے عزیز دوست ممتاز شاعر ناصر عدیل کا کہنا ہے کہ علم عروص شاعری پر تنقید کرنے والوں کی ضرورت ہے، شاعر کو ردھم پر عبور ہونا چاہئے ردھم کو سمجھے بغیر شاعری ممکن ہی نہیں، جو لوگ عروص کے بل بوتے پر شاعری کرتے ہیں، وہ لوگ اپنے خیالات کو فاعلاتن فاعلات کے وزن سے بوجھل کرنے کے سوا کچھ نہیں کرتے۔

مقتول قاتل

خاکہ

منور جمیل قریشی

منور جمیل قریشی سے میرے تعلقات کئی عشروں پر محیط ہیں۔ پرانی یادیں آتی ہیں تو آنکھوں مین چراغوں کا دھواں بھر جاتا ہے کئی بچھڑے ہوئے ساتھی یاد آنے لگتے ہیں۔ منور جمیل قریشی کو جب بھی دیکھا، یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوگیا کہ وہ منور زیادہ ہیں یا جمیل۔ صورت کے اعتبار سے جمیل ہیں اور سیرت کے اعتبار سے منور ہیں۔ گندمی رنگت، ابھرے ابھرے نقش و نگار، متناسب اعضاء، مناسب قد وقامت، بولتے ہین تو یوں لگتا ہے جیسے چہک رہے ہوں۔ بولنے میں اٹکنے کا امکان ہوتا ہے۔ چہکنے میں ایسا کوئی خدشہ لاحق نہیں ہوتا۔ اچھے دوست ہین مگر ان کے جو ہر دشمنی میں کھل کر سامنے آتے ہیں، اگر چہ تعلق بہت پرانا ہے مگر اتنا پرانا بھی نہین کہ لنگوٹیا کہا جاسکے۔ یوں بھی لنگوٹ کسنے میں جس اہلیت کی ضرورت ہوتی ہے وہ کہاں سے لائیں۔

یوں تو جمیل بھائی اپنی ذات میں انجمن ہیں اس کے باوجود انجمن سازی ان کا شوق ہے۔ شوق کا کوئی مول نہیں ہوتا۔ جہاں مول نہیں ہوتا وہاں تول کا سول ہی پیدا نہیں ہوتا مگر جمیل بھائی کی خوبی ہے کہ بغیر مول کے تول کا توازن اپنے حق میں رکھتے ہین۔ ’’قلم قبیلہ‘‘ کا قلم ٹوٹنے کے بعد انہوں نے چولستان ادبی فورم کے نام سے ایک ادبی انجمن تشکیل دی جو ان دنوں خاصی فعال ہے۔ بعض لوگ اسے آستانہ جمیلہ کے نام سے یاد کرتے ہیں کیونکہ جب بھی کسی تحریر میں جمیل بھائی کا ’’ذکر خیر‘‘ ہو یہ بزم متحرک ہو جاتی ہے۔ کچھ دن قبل روزنامہ ’’پاکستان‘‘ کے ادبی صفحے میں نوشی گیلانی کی مداحی میں ن۔ش کے نام سے ایک تحریر شائع ہوئی تھی اور یہ ایک ایسی بات تھی جو ’’فرقہ جمیلیہ‘‘ کے لئے ’’ممنوعات‘‘ مین شامل ہے۔ سو، اس تحریر پر ’’گفتگو‘‘ کا اہتمام کیا گیا جس میں قرارداد مذمت پیش کی گئی حالانکہ تحریر میں صرف یہ انکشاف کیا گیا تھا کہ پروین شاکر کی مقبولیت نوشی گیلانی کے تعاقب میں ہے۔ یہ ایک ایسی تحقیق ہے جو فرقہ جمیلیہ کے حلق سے نیچے نہیں اتر سکتی۔ ہم بھی ایسی

ہی غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں۔محترم ڈاکٹر انور سدید کا خاکہ ’’مرد آہن‘‘ کے عنوان سے لکھا تو منور جمیل قریشی اور نوشی گیلانی کو بھلے وقتوں کی ادبی جوڑی کہہ دیا۔یہ محض ایک اتفاق تھا کیونکہ ہماری نظر میں محترم وزیر آغا اور جناب ڈاکٹر انور سدید ایک ایسی ادبی جوڑی ہے جو نا قابل شکست ہے۔اسی حوالے سے منور جمیل قریشی اور نوشی گیلانی کا تذکرہ بھی ہوا تھا۔جمیل بھائی کے بقول چولستان ادبی فورم کے اراکین نے اسے بے ربط تحریر قرار دے دیا اور اس پر گفتگو کا اہتمام بھی کر ڈالا،موصوف نے ہمیں بھی مدعو کیا تا کہ ہم اپنے اڑتے ہوئے پرزوں کو سمیٹ سکیں ان کی دعوت پر ہمیں چچا غالب بہت یاد آئے جنہوں نے کسی ایسی ہی صورت حال کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا:

سنا تھا غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشہ نہ ہوا

واقعی تماشا نہ ہوا اور ہم لوڈ شیڈنگ کی افادیت کے قائل ہو گئے۔اس دن لوڈ شیڈنگ کی طوالت کے باعث چولستان ادبی فورم کا اجلاس ملتوی نہ ہوتا تو شاید ہمارا جلوس نکال دیا جاتا۔تاہم اس امکان کو بھی مسترد نہیں کیا جاسکتا کہ جمیل بھائی کی خواہش خبر نہ بنتی کیونکہ ہم نے فرداً فرداً متعدد دوستوں سے ملاقات کی تو انہوں نے ’’مرد آہن‘‘ پر گفتگو سے قطعی لاعلمی کا اظہار کیا اور ہمیں یہ باور کرانے کی سعی مشکور کی کہ چولستان ادبی فورم ایک ادبی تنظیم ہے کسی پیرومرشد کا آستانہ نہیں اگر ’’مرد آہن‘‘ پر گفتگو ہوتی تو صرف ادبی حوالے سے کیونکہ خاکہ نگاری میں شرارت نگاری کا عنصر نہ ہو تو خاکہ لکھنے اور خاک اڑانے میں کوئی فرق نہیں رہتا۔

کسی محفل میں ہمارا ذکر خیر ہو رہا تھا جمیل بھائی کہنے لگے وہ اس شہر کا سب سے برا آدمی ہے وہاں موجود ایک شخص نے کہا ’’ناصر بھائی بہت اچھے آدمی ہیں‘‘۔

’’تم اسے نہیں جانتے‘‘ جمیل بھائی نے اسے جھڑک دیا۔

’’آپ کس وجہ سے انہیں برا آدمی سمجھتے ہیں‘‘ اس نے پوچھا۔

’’میں مومن کی آنکھ سے دیکھتا ہوں اور مومن کی فراست سے سوچتا ہوں‘‘۔وہ لپک کر آیا اور جمیل

بھائی سے لپٹ گیا ''ایہٹ! یہ کیا کر رہا ہے؟'' جمیل بھائی نے اسے پرے دھکیلتے ہوئے کہا۔
'' آپ بھی مومن ہیں'' فرط انبساط سے اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔
'' ابے نہیں میرے چہرے پر عیاں اس کیفیت کا سبب کچھ اور ہے۔'' جمیل بھائی نے اسے سمجھایا۔
اب تک تو یہی سنتے آئے تھے کہ عشق آدمی کو شاعر بنا دیتا ہے مگر ہماری آنکھوں نے یہ منظر بھی دیکھا ہے کہ عشق نے شاعر کو آدمی بنا دیا۔ منور جمیل قریشی! اچھے بھلے شاعر تھے، شاعری کرنا مشاعرے کرانا اور ادبی تقاریب منعقد کرانا ہی ان کا نصب العین تھا پھر یوں ہوا کہ انہین ایک سانولی سلونی لڑکی سے عشق ہو گیا۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ وہ عشق کی بھٹی میں کندن بن کر نکلتے مگر ہوا یوں کہ عشق کی تپش نے ان کی شاعری کو جھلسا دیا ہر وقت تصور جاناں میں گم رہنے لگے۔ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی اور جمیل بھائی! مرزا غالب کے اس شعر کی تجسیم بنتے گئے۔

عمر میری ہوئی صرف بہار حسن یار
گردش رنگ چمن ہے ماہ وسال عندلیب

ان کی شاعری کا مجموعہ '' دیکھو یہ میرے خواب ہیں'' احمد فراز کے ایک شعر:

دیکھو یہ میرے خواب ہیں، دیکھو یہ میرے زخم ہیں
میں نے تو سب حساب جاں برسر عام رکھ دیا

سے ماخوذ ہے مگر ان کی کتاب میں خواب ہی خواب ہیں۔ زخموں کا نام ونشان تک نہیں، نہ زخموں سے اٹھنے والی ٹیسیں محسوس ہوتی ہیں۔ کہتے ہیں ادب سے متعلق بہاول پور کے ادبی اور ثقافتی اداروں اور حلقوں پر ان کی حکمرانی ہے۔ جسے چاہتے ہیں عرش پر بٹھا دیتے ہیں جسے نہ چاہیں، اسے دفن کر دیتے ہیں۔ ہم تحقیق کے باوجود کوئی ایسا قبرستان دریافت نہ کر سکے جہاں جمیل بھائی نے کسی کو دفن کیا ہو۔ بعض لوگوں کو یہ کہتے ہوئے بھی سنا ہے کہ منور جمیل قریشی جسے دفن کرنا چاہیں وہ اسپرنگ کی طرح اچھل کر اور نمایاں ہو جاتا ہے۔ شنید یہ ہے کہ بہاول پور کے ادبی افق پر اجاگر ہونے کے لئے '' فرقہ جمیلیہ '' کی رکنیت لازمی ہے اور اگر وہ شخص '' مسلک شہابیہ '' کا مقلد ہو تو سارا

عالم وجد میں آ جاتا ہے مگر لوگوں کا کیا ہے وہ تو اچھوں کو بھی برا کہتے ہیں۔ خلقت خدا تو کہنے کو افسانے مانگتی ہے۔ بھلا یہ بات ماننے والی ہے کہ منور جمیل کی شاعری سے کافور کی بو آتی ہے۔ تاہم ہوا کی سرگوشیوں سے شناسا ساعتوں کی تکذیب مشکل ہے۔ ہوا کے دوش پر سفر کرنے والے نغموں کی بازگشت فضائے بسیط کی امانت ہوتی ہے اور یہ ایسی امانت ہے جس میں خیانت ممکن ہی نہیں۔

جمیل بھائی کا دعویٰ ہے

میں تیرگی میں محبت کی اک کہانی ہوں
کوئی چراغ ساعنوان مری تلاش میں ہے

یقیناً کوئی چراغ ساعنوان جمیل بھائی کا مقدر ہوتا اگر وہ یہ الزام نہ لگاتے

تم تو ہر نئی صبح
دلبرانہ آنکھوں میں
اک نئی رفاقت کا خواب لے کر اٹھتے تھے
اور اپنی شاموں میں
اپنے خواب و خواہش کے
بے لباس جذبوں کو
شوق سے سجاتے تھے۔

شاہد اختر امام رضوی نے جمیل بھائی کے لئے ہی کہا تھا۔

وفا کے نام پر ہم نے انتہا کر دی
خود اپنے قتل کی سازش اسے بنا کر دی

جمیل بھائی! اکثر گنگنایا کرتے تھے

نہیں ضرورت زخموں کو مرہم کی
ضدی لڑکی بات نہ مانے موسم کی

اب یہ حال ہے
اپنے دل کی مٹھیوں کو
کھول کر دیکھو ذرا
ان میں میری خواہشوں کے
کتنے جگنو قید ہیں

شاید جمیل بھائی! ابھی تک یہ جان ہی نہ سکے کہ جگنو مٹھی میں قید ہو جائیں تو اپنی روشنی کھو دیتے ہیں۔ گرم مٹھی مفادات کا تحفظ تو کرتی ہے مگر جذبوں کو کملا دیتی ہے، بجھا دیتی ہے۔

جمیل بھائی! کو یہ زعم بھی تھا
ضبطِ غم نے بچا لیا ورنہ
ہم کوئی داستان ہو جاتے
ترے کردار کی نیت کا پتا ہے لیکن
اس رفاقت کو تماشا نہیں ہونے دوں گا

مگر انہوں نے اس رفاقت کو تماشا بنا کے چھوڑا۔ البتہ جمیل بھائی! کی اس بات سے انکار ممکن نہیں۔

اس میں جتنی روشنی ہے، اس میں کچھ میری بھی ہے

اور یہ سارا فساد اسی ''کچھ'' کا ہے اگر یہ ''کچھ'' ضدی لڑکی تک پہنچتے پہنچتے ''کچھ کچھ'' ہو جاتا تو جمیل بھائی! کو یہ کہنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔

تو ایک بار محبت سے دیکھ لیتا اگر
زمین خود کو تجھے آسمان بنا لیتے

مگر یہ کہنے سے بھی ان کی تشفی نہ ہوئی تو کہا:

اس کو آسماں، خود کو زمیں کر لیا

مجھ سے تو اس نے جو کہا، میں نے یقیں کر لیا

اب یہ اور بات ہے کہ یہ داستان بہت پرانی ہے۔ ان کے کسی پیش رو کو بھی کسی ضدی لڑکی سے واسطہ پڑا تھا اور اس نے صرف اتنا ہی کہنے پر اکتفا کیا تھا

قرب کی اس تشنگی کا ہو مداوا کس طرح

میں زمین بنتا گیا، وہ آسماں ہوتا گیا

کاش! جمیل بھائی! اپنے اس عہد پر قائم رہتے۔

کھیل جو تھا، جاناں! اب حساب کیا کرنا

جیت جس کسی کی ہو، ہم نے ہار مانی ہے

منڈا پیر

خاکہ

ڈاکٹر فرحت عباس

ناصر حسنی

نام فرحت عباس، پیشہ مسیحائی، مشغلہ شاعری، ذہن تعمیری مگر براہو شاعری کا جس نے اچھے بھلے بندے کو خواب و خیال تک محدود کر دیا ہے۔ کومل جذبوں کے بعض افراد اسے ایسا بندا سمجھتے ہیں جو رنگیلے بازار میں گم ہو چکا ہے۔ فرحت عباس اپنے وقت کا حاتم ہے چونکہ اس کا تعلق طائی قبیلے سے نہیں ہے اس لئے وہ کسی بھوکے کیلئے اپنا گھوڑا ذبح نہیں کرتا خیالی پلاؤں پر ٹرخاتا ہے ایک روایت کے مطابق وہ اپنے طالب علموں کو اٹانومی پڑھانے کے بجائے ٹرخالوجی پڑھاتا ہے۔ ضرورت مندوں کو ہوائی قلعہ بنا کر دیتا ہے بے کاروں کو نہ صرف ہوائی گھوڑے عطا کرتا ہے بلکہ اصطبل بھی بخش دیتا ہے۔

پٹھان اور بلوچ اپنے گھروں سے قرآن کے سائے میں نکلتے ہیں، اہل پنجاب دعاؤں کا سائبان لے کر چلتے ہیں اور کراچی والے امام ضامن بندھوا کر اپنے گھروں سے برآمد ہوتے ہیں مگر فرحت عباس اپنے گھر سے بشارتوں کی ٹوکری لے کر نکلتا ہے وہ اس روایتی پیر کا فوٹو اسٹیٹ ہے جو ہر مرید کو منڈا دیتا ہے، ویسے جسامت کہ اعتبار سے وہ مستند پیر ہی لگتا ہے۔ بھرا بھرا جسم، سرخ رنگت، شوخ چمک دار آنکھیں، پیٹ اپنی حدود سے تھوڑا بڑھا ہوا جو فی الحال تجاوزات کی زد میں نہیں آتا مگر اس امکان کو مسترد بھی نہیں کیا جا سکتا۔

ہونٹوں پر مسکراہٹ کی کمان جو ہمہ وقت اپنے ہدف کی متلاشی رہتی ہے اس کے چھوڑے ہوئے اکثر تیر، تیر بہ ہدف ہوتے ہیں اگر وہ غالب کے دور میں ہوتا تو مرزا جی زلف کے سر ہونے کی بات کرنے کے بجائے اپنے عہد کو سر ہونے کا تذکرہ کرتے۔ یہاں زلف کو عہد میں بدلنے سے ہمارا منشاء فرحت عباس کے بے زلف ہونے کی نشان دہی کرنا نہیں کیونکہ فارغ

البال ہونا خوش بختی کی علامت ہے۔اسے دیکھ کر بہت سے احباب نے سوچا ہوگا کہ وہ فرحت عباس کے بجائے فرحت نواز ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا؟

لوگ کہتے ہیں، نام رکھنے کے معاملے میں والدین بہت ہی سادہ لوح واقع ہوئے ہیں مگر تجربہ اور مشاہدہ گواہ ہے کہ نام انسان کے کردار کا غماض ہوتا ہے نام انسان کی شخصیت کے مخفی گوشوں کو عیاں کرتا ہے۔ ہمارا واسطہ بارہا ایسے لوگوں سے پڑتا ہے جن کی رنگت تو الٹے توے جیسی ہوتی ہے مگر نام کا فور خان ہوتا ہے لیکن جوں جوں ان کی شخصیت کی پرتیں کھلتی ہیں کافی کی بو کا احساس بڑھتا جاتا ہے کبھی کبھی کافی کی بھینی، بھینی، خوش کن خوشبو دل و دماغ کو معطر بھی کرنے لگتی ہے فرحت عباس کی ساری شخصیت اس کے نام کے زیر اثر ہے اس کے نام کا پہلا حصہ واقعی فرحت بخش ہے، وہ فرحت کشید کرنے کا ہنر جانتا ہے اب یہ ایک الگ بات ہے کہ وہ فرحت کو گنڈیریوں کی طرح کشید کرتا ہے، عباس اس کے نام کا دوسرا حصہ حق وصداقت کا علم بلند رکھنے کی علامت ہے مگر ہم اس کے قلم بردار ہونے کے گواہ ہیں۔

چھوٹی بحر میں بڑی شاعری اور بڑی بحر میں چھوٹی شاعری اکثر شعراء کا مسئلہ رہا ہے مگر فرحت عباس شاعری کو محض شاعری سمجھتا ہے۔ چھوٹی بڑی کے چکر میں پڑھ کر وہ شاعری کے دل داد وں کا دادا بننا پسند نہیں کرتا یوں بھی شاعری چھوٹی بڑی نہیں ہوتی۔ چھوٹی بڑی تو بھابیاں ہوا کرتی ہیں اور اگر کوئی بھابھی کسی غریب کی جورد ہو تو وہ ہمیشہ چھوٹی ہی ہوتی ہے بلکہ اکثر اوقات دو چھوٹی بھی ہوتی ہے۔ ویسے اکثر شعراء شاعری کے ساتھ وہی سلوک کرتے ہیں جو محلے کے لونڈے غریب کی جورو کے ساتھ روا رکھتے ہیں۔

کسی شخص کے بڑے ہونے کی ایک بڑی دلیل یہ بھی ہے کہ وہ متنازع شخصیت کا حامل ہوتا ہے اور یہ ایک ایسا پیمانہ ہے جس سے کسی بھی بڑی شخصیت کی پیائش کی جاسکتی ہے۔ اس معیار کا اطلاق اگر فرحت عباس پر کیا جائے تو وہ یقیناً ایک بڑی شخصیت کا مالک ہے۔ وہ ایک ایسا متنازع شاعر ہے جس کے بارے میں ہر راوی کی روایت مختلف ہے۔ کسی بزرگ شاعر نے ایک

باراس کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ فرحت عباس جس قد وقامت کا شاعر ہے اس کا وزن میری نظروں میں ہے، حالانکہ ان کی نظروں کے پلڑوں میں اتنا پاسنگ تھا کہ وہ کوشش کے باوجود ڈنڈی نہیں مار سکتے۔ ہمارے خیال میں شاعر کی جسمانی ساخت اور اس کا ڈیل ڈول اس کی شاعرانہ حقیقت کو متاثر نہیں کر سکتا اگر شاعر کا جسمانی وزن شخصیت کو بھاری بنانے کا باعث ہوتا ہے تو علامہ اقبال اور جوش اردو کے سب سے بڑے شاعر ہوتے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ عدم اردو کے سب سے بڑے شاعر ہوتے، غالب اور میر کا نمبر بہت بعد میں اور کبھی کبھی تو یہ حضرات شاعروں کی فہرست ہی سے غائب ہو جاتے، اس لئے شاعر کے وزن کو نظروں میں تولنے کے بجائے اس کی شاعری کو غور وفکر کے ترازو میں تولنا چاہیے۔

فرحت عباس ایک خود شناس شاعر ہے وہ معاصرانہ چشمک کے دوران دوستوں کی کمک طلب نہیں کرتا بلکہ اپنی لڑائی آپ لڑتا ہے اور اس لڑائی میں مرغ پنچ اور بٹیر پنچ مارنا زیادہ پسند کرتا ہے۔ یہاں بھی اس نے یہی کیا اس بزرگ کو ایسا مرغ پنچ مارا کہ پہلے ہی وار میں ڈھیر کر دیا۔ دیکھیئے ! کیا خوب صورت پنچ ہے۔

تم بعد میں پرکھنا میرے قد کے زاویے
پہلے تمہاری آنکھ کو بینائی تو ملے

سدا بہار

خاکہ

ظہور آثم

ناصر حسنی

ظہور آثم جدید لب و لہجے کا ایک ممتاز شاعر ہے وہ مقدار سے زیادہ معیار کا قائل ہے اس لیے کم گوئی اس کی فطرت بن گئی ہے بعض دوست اس کی شاعری کو ''خاموش شاعری'' کہتے ہیں مگر اس کی خاموشی شاعری محترمہ بے نظیر بھٹو کی خاموش سفارت کاری'' سے مختلف ہے کیونکہ ظہور آثم کی خاموش شاعری آنے والی نسل کو قوت گویائی کے نئے انداز سے روشناس کرائے گی۔

شکل صورت سے مجنوں دکھائی دیتا ہے مگر یہ دیوانہ با کار خویش ہوشیار ہے، ہمارے ہاں دو قسم کے شاعر پائے جاتے ہیں ایک قسم قلموں والے شاعروں کی ہے، دوسری قسم قلم والوں کی ہے۔ موصوف کا تعلق دوسری قسم سے ہے، ظہور آثم کو اس بات پر خدا کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ شاعروں میں تیسری قسم نہیں ہوتی۔

لہجہ اتنا دھیما ہے کہ بلند سے بلند شعر بھی پست ہو جاتا ہے بعض اوقات جدیدیت کے عشق میں اتنا آگے بڑھ جاتا ہے کہ چکھنے کے عمل کو بھی آنکھوں سے سرانجام دیتا ہے بارہا سمجھایا کہ میاں! جب تک تمہاری آنکھ میں پھولا وغیرہ نہ ہو ہر کام ممکن نہیں مگر اس کو اصرار ہے کہ بعض چیزیں ظاہری آنکھ سے دکھائی نہیں دیتیں اور اس کا یہ خیال ایک حد تک درست بھی ہے ہم خود بھی اس کو باطنی آنکھ سے دیکھتے ہیں اور اکثر عمر رسیدہ لوگ تو اس کو عینک لگا کر بھی نہیں دیکھ سکتے۔

نسب کے اعتبار سے قریشی ہے مگر جب سے یہ بات اس کے علم میں آئی ہے کہ ابوجہل بھی قریشی تھا، اس نے اپنے نام کے ساتھ قریشی لکھنا چھوڑ دیا ہے جہاں تک حسب کا تعلق ہے تو اس کا قارواہ مشہور سائیں دان ایڈیسن اور معروف و ممتاز سیاست دان آئزن ہاور سے ملتا ہے۔

جسمانی لحاظ سے سدا بہار ہے، کہنے کو تین بچوں کا باپ ہے مگر پشت کی جانب سے خود

بچہ لگتا ہے۔ نقش ونگار ایسے کہ تحقیق کے بغیر ہی قلوپطرہ کی نسل کا آخری فرد تسلیم کرنے کو جی چاہتا ہے۔

فطرتاً انتہا پسند ہے جب کسی کو پسند کرتا ہے تو ''من تو شدم تو من شدی'' والا معاملہ بن جاتا ہے اور جب کسی سے گریزاں ہوتا ہے تو خوفزدہ ہرن کی طرح مسترد شخص کے سائے سے بھی بدکتا ہے کسی زمانے میں ''دی ماسٹر'' خورشید ناظر کا بڑا زبردست مداح تھا، ہر وقت بھائی جان! بھائی جان! کا ورد کیا کرتا تھا مگر ان سے تین پانچ ہوئی تو اپنے سگے بھائی سے بھی دور دور رہنے لگا، شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ورد کا تعلق وظیفے سے ہوتا ہے اور اکثر اوقات وظائف الٹے بھی ہو جاتے ہیں اور ان کے مئوکل پچھل پائی بن کر پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ظہور آثم کا المیہ یہ ہے کہ اس کا پیچھا ضرورت سے کچھ زیادہ ہی ہلکا ہے۔

ہائی کورٹ کی ملازمت اس کو ہائی سوسائٹی کا فرد تو نہ بنا سکی مگر اس کے والد کے ایسے دو بیگھے زمین منظر عام پر لے آئی جو پٹواری کی مہربانی کے سبب دریابُرد ہو چکی تھی، عدالتی فیصلہ اس کے حق میں ہو چکا ہے مگر عدالت کی یہ ذمہ داری تو نہیں کہ وہ قبضہ بھی دلائے۔سو، جب تک غاصب کے ہاتھ میں لاٹھی ہے موصوف اپنی بھینس کا دودھ نہیں پی سکتے۔

بہاول پور ہزار جہت شہر ہے۔ یہاں کے لوگ انفرادیت پسند ہیں یہی وجہ ہے کہ یہ ''گھر دامادی'' کے بجائے آفس دامادی زیادہ پسند کرتے ہیں۔ظہور آثم کی زندگی میں ایسا واقعہ ظہور پذیر ہوا تھا مگر اس نے آفس دامادی کی تجویز مسترد اور لڑکی نے اس کو مسترد کر دیا یوں اس کی محنت کو کسی اور نے ہائی جیک کر لیا اور وہ انتقاماً دوسروں کی محنت ہائی جیک کرنا میں اپنی توانائی ضائع کرنے لگا۔اس نے اپنی عملی زندگی کا آغاز شناختی کارڈ کے محکمے میں اسسٹنٹ فوٹوگرافر کی حیثیت سے کیا تھا وہ گاؤں گاؤں، قریہ قریہ پھر کر لوگوں میں شناخت تقسیم کرنے کا فریضہ سرانجام دیا کرتا تھا مگر جب وہ محکمانہ چھانٹی کی زد میں آیا تو اپنی شناخت گنوا بیٹھا، ان دنوں کسی بدقماش عاشق کی طرح گلی گلی گھوم کر لوگوں کو تازہ خبریں فراہم کرتا ہے اور مفادات کی دفلی پر سبز رُتوں کا راگ الاپنے

والوں سے دوروٹی کے سوال کا طلبگار رہے۔

شعر بھاری بھرکم کہتا ہے مگر خود اتنا کم وزن ہے کہ ہوا کے رخ پر چلتا ہے۔شنید ہے کہ محترم قاسم رشید فاروقی بہاول پور سے جب لاہور منتقل ہونے لگے تو اپنی نیکریں یہیں پر چھوڑ گئے تھے جنہیں یہ پتلون کے طور پر استعمال کیا کرتا تھا۔

ہمارے مشترکہ دوست رئیس الرحمان کی ایک روایت کے مطابق ظہور آثم پہلے خود کو ظہور احمد قریشی لکھا کرتا تھا مگر ایک بار اس کو بذریعہ ڈاک انجمن قریشیاں کا رکنیت فارم موصول ہوا جس کو دیکھ کر موصوف نے قریشی لکھنا چھوڑ دیا۔اس معاملے میں انجمن قریشیاں بے قصور ہے کیونکہ اس کی رہائش ایک ایسے علاقے میں ہے جہاں قصابوں کی اکثریت ہے۔

مردِ رشید

خاکہ

قاسم رشید فاروقی

ناصر حسنی

نام قاسم رشید فاروقی ہے۔ دیکھنے میں مرد رشید لگتے ہیں۔ بڑے اسم باسمی قسم کے آدمی ہیں محکمہ فیملی پلاننگ کے تربیت یافتہ ہیں۔ ظاہر ہے موصوف ریوڑیاں تو ہرگز نہیں بانٹتے ہوں گے۔ نظر کے ساتھ حافظہ بھی تھوڑا کمزور ہے۔ اس لیے آنکھوں پر عینک اور نام کے ساتھ نسبت لگائے رکھتے ہیں۔ کبھی وہ پاپولیشن آفیسر تھے مگر ابھی تک تشہیر وہ کسی قدر بڑھاؤ گولیاں بنانے والی کمپنی کی کرتے ہیں۔ پھیلاؤ سے زیادہ سر بلند ہونے کے قائل ہیں۔ قدوقامت کے اعتبار سے ہزاروں میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ قانون کے ہاتھوں کی طرح ان کے ہاتھ بھی خاصے لمبے ہیں ادب کے ہر پھٹے حصے میں ٹانگ اڑاتے ہیں بس ذرا فاعلاتن فاعلات کے مقام پر پٹڑی سے اتر جاتے ہیں افسانے ہمیشہ اپنی جسامت کی طرح طویل مختصر لکھتے ہیں۔

ان کی کینہ پروری کا تو ہمیں کوئی تجربہ نہیں مگر ہم ان کی وفاداری بشرط استواری کے چشم دید گواہ ہیں وہ جب تک خاندانی منصوبہ بندی کے محکمہ سے بطور پاپولیشن آفیسر وابستہ رہے ان کی شریک حیات غوں غاں کی آواز کو ترستی رہی مگر جب ان کے محکمہ نے ان سے آنکھیں پھیر لیں اور وہ جمع تفریق کے چکر میں پڑے ان کی بیگم کے ستارے بھی گردش سے نکل آئے اب وہ خیر سے صاحب اولاد ہیں۔

فقرے بازی اچھی کر لیتے ہیں۔ اس معاملے میں پروفیسر انور صابران سے سخت مالر جک ہیں۔ ان کا قارورہ صرف خورشید ناظر سے ملتا ہے۔ ادبی محفلوں میں یہ جوڑی خوب سجتی اور خوب چہکتی ہے صلح جو اور امن پرست قسم کے آدمی ہیں۔ اس لیے بعض مقامات پر جھک جاتے ہیں۔ یاروں کے یار دشمنوں کے دوست بھی ہیں۔ آنکھیں کھلی رکھنے کے عادی ہیں مگر ماہ رمضان

میں اکثر و بیشتر ان کی آنکھ لگ جاتی ہے۔ سگریٹ نوشی میں بلا نوش واقع ہونے میں ہر وہ برانڈ ان کا پسندیدہ ہے جس کا چرٹ مد والے الف کی طرح لمبا ہو۔ اگر قیافہ کا کوئی ماہر ان کو سگریٹ نوشی کی حالت میں دیکھ کر قیافہ لڑائے تو لڑائی یقینی ہوگی کہ وہ سگریٹ پیتے کم ہیں اور اس کے فلٹر سے میز یا کرسی زیادہ ٹھونکتے ہیں۔

سوائے دستر خوان کے کسی اور ہلکی پھلکی چیز کے دلدادہ نہیں۔ روٹی سے زیادہ پھلکیاں پسند کرتے ہیں۔ ورزش کی افادیت کے زبردست قائل ہیں۔ مگر نفاست پسند ہونے کی وجہ سے مگدر ہلا سکتے ہیں اور نہ ہی بیٹھکیں لگانے کی زحمت گوارا کرتے ہیں۔ بس بیٹھے بیٹھے جی کھول کر قہقہے لگاتے ہیں اور پھیپھڑے مضبوط کرتے ہیں۔ یوں ہلدی لگتی ہے نہ پھٹکڑی اور رنگ چوکھا آتا ہے۔

احباب ان کو میرا جی، صادقین اور ڈاکٹر مبشر کے مختلف اعضا کا مرکب کہتے ہیں مگر ماہرین کی رپورٹ کے مطابق احباب کی رائے سراسر غلط ہے کہ قد کی لمبائی مشابہت کی شرط بن جائے تو آدمی کم اور اونٹ زیادہ کہلائے۔ عینک لگانا بھی یکسانیت کی شرط نہیں کہ عینک تو ہٹلر سے بھی مختص رہی ہے۔ گالوں کا پچکا ہوا ہونا بھی مشابہت سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا کہ ہر رس دار پھل کا مقدر پچکنا ہوتا ہے۔

شیریں کلام

خاکہ

فاروق عمر خان

تحریر: ناصر حسنی

دراز قامت، ورزشی جسامت، چوڑی پیشانی، دلکش مسکراہٹ، گندمی رنگت، لبوں سے ٹپکتی شرینی نے ایسا شیریں بیان بنادیا کہ جس نے چند ملاقاتیں کیں۔شوگر کا مریض بن گیا۔شاید شیریں کلام ہونا ایسا وبائی مرض ہے کہ آدمی خود بھی اس کی زد میں آجاتا ہے۔ماہر تعلیم فاروق عمر کا شمار بھی ایسی ہی شخصیات میں ہوتا ہے جن کی شیریں بیانی سبھی کو اپنا گرویدہ بنالیتی ہے۔کہتے ہیں ان کی آنکھیں بھوری ہیں۔مگر ہمیں شربتی لگتی ہیں۔شربتی آنکھوں سے شربت جھلکے یا نہ جھلکے،تشنہ لبی کا احساس ضرور مٹ جاتا ہے۔شربتی آنکھوں میں سنہرا پن نمایاں ہوتا ہے اور بھوری آنکھوں میں یہ رنگ مدھم ہوتا ہے۔آنکھیں شربتی ہوں یا بھوری ان کی صحت پر کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ عمر کے اس مقام پر کھڑے ہیں، جہاں حسن و جمال کی نہیں، وقار کی حکمرانی ہوتی ہے۔اللہ نے انہیں ایک باوقار شخصیت سے نوازا ہے۔موصوف نے اتنا ادب تخلیق نہیں کیا، جتنے ادیب تخلیق کیے ہیں۔علالت کے باوجود پندرہ روزہ ''حقیقت'' بہاول پور کی ادارت سے غافل نہیں رہتے۔اکثر لوگ رشتے ناتے اور تعلق نبھانے کیلئے ذاتی مفادات کو فوقیت دیتے ہیں فاروق عمر کی خوبی یہ ہے کہ وہ احباب واقارب کے معاملے میں اتنے بے نیاز ہیں کہ جو بھی ملتا ہے۔نیازمندی کے حصار میں قید ہوجاتا ہے۔گفتار ہی کے نہیں کردار کے بھی غازی ہیں۔ان کا شماران مخصوص اساتذہ میں ہوتا ہے جنہوں نے اسکول، کالج اور یونیورسٹی میں اپنے فرائض سرانجام دیے ہیں۔تعلیم و تربیت کا انداز اتنا دلکش تھا کہ جس ادارے سے بھی منسلک رہے طلبا کی پسندیدہ شخصیت بن گئے۔بظاہر کھلاڑی لگتے ہیں مگر ذہنی طور پر بھی روایتی پروفیسر ہیں۔گویا محاورے اور حقیقت دونوں ہی کا اطلاق ہوتا ہے۔

درس وتدریس دل و دماغ ہی میں نہیں، رگ و پے میں بھی سمایا ہوا ہے۔ پڑھنے پڑھنے اور پڑھانے ہی کو زندگی کا مقصد سمجھتے ہیں۔ اس ضمن میں ایک واقعہ خاصا دلچسپ اور مشہور ہے۔ اسٹاف کی میٹنگ ہو رہی تھی۔ کھیلوں کے عالمی مقابلے ہو رہے تھے۔ پاکستان اور بھارت کی ٹیم کے درمیان مقابلہ ہو رہا تھا۔ اسکول کی چھٹی تھی۔ میٹنگ ختم ہوئی تو کلاس روم کا رخ کیا۔ بورڈ پر مسئلہ فیثا غورث لکھا اور طلبا سے ہی سوالات کرنے لگے کوئی جواب نہ ملا۔ کلاس روم پر نظر دوڑائی تو خاموشی کا راز کھلا، چھٹی کی وجہ سے طلباء نہیں آئے تھے۔ آپ خالی کرسیوں کو مسئلہ فیثا غورث پر غور کرنے کا درس دے رہے تھے۔ چوکیدار کلاس روم کو تالا لگانے آیا تھا۔ اس صورت حال سے خوب لطف اندوز ہوا اور پھر اس واقعہ کو خوب نمک مرچ لگا کر دوسروں کو سنایا۔ اس غیر حاضر دماغی نے موصوف کو مشہور ہستیوں کی صف میں شامل کر دیا۔ لوگوں کو یقین ہو گیا کہ موصوف کو پڑھانے کا اتنا شوق ہے کہ طلبا نہ ہوں تو خالی کرسیوں کو سبق پڑھانے لگتے ہیں۔

ان کے دورِ جوانی میں نیشنل سینٹر بھی پورے شباب پر تھا۔ آئے دن کوئی نہ کوئی تقریب ہوتی رہتی تھی اور اس تقریب میں موصوف کی موجودگی یقینی ہوتی تھی۔ جانے والی حکومت کی برائی تو نہ کرتے مگر آنے والی حکومت کی تعریف اور اس سے وابستہ بہتری کی توقعات کا اظہار ضرور کرتے تھے۔ پیپلز پارٹی کی حکومت آئی بھٹو مرحوم کی برسی کی تقریب تھی اور حسب معمول انتظامیہ نے تقریب کی صدارت آپ کے نام کردی۔ رانا پٹیالوی پیپلز پارٹی کے ایسے سرگرم رکن تھے کہ سردیوں میں بھی پسینے سے شرابور رہا کرتے تھے ان کے کانوں میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں اور دھڑکن بے ترتیب ہونے لگیں۔ پسینہ ایڑیوں تک پہنچا تو ایڑی پر گھوم کا انتظامیہ تک جا پہنچے اور کہنے لگے: تقریب کا بیڑا کیوں غرق کرنا چاہتے ہو۔ انتظامیہ نے وضاحت چاہی تو کہا کہ فاروق صاحب پی پی کے سخت مخالف ہیں۔ رانا جی کی سرتوڑ کوشش کے باوجود انتظامیہ نے فاروق عمر کی صدارت نہ توڑی بعض روایات بہت مضبوط ہوتی ہیں۔ انہیں توڑنے والا اپنا سر پھوڑنے کے سوا کچھ نہیں کرسکتا۔ سو، رانا پٹیالوی بھی اپنا سر پھوڑ کر رہ گئے۔ جل جلال تو آئی بلا تھے کا درد بھی کام نہ

آیا۔صدارتی خطاب کا آغاز ہوا تو رانا جی کی بے چینی نے بہت سے جیالوں کو بے چین کر دیا مگر تقریر اتنی دل پذیر تھی کہ جیالوں کے دل میں اتر گئی۔تقریر کے دوران ہال جئے بھٹو کے نعروں سے گونج اٹھا اور رانا جی کا منہ حیرت سے کھلتا گیا۔تقریب کے بعد رانا پٹیالوی نے پوچھا۔فاروق بھائی! آپ کا تعلق کس پارٹی سے ہے۔جواب دیا گیا کہ میرا تعلق پاکستان سے ہے۔میری پیشانی پر کسی پارٹی کی مہر ثبت نہیں ہے۔اس لئے کسی پارٹی کو برا نہیں کہتا البتہ ہر پارٹی کی اچھائیاں اور خو بیاں بیان کرتا رہتا ہوں۔رانا پٹیالوی سر کی چوٹی سے پاؤں کی ایڑی تک پیپلی تھے،مرتے دم تک پیپلی ہی رہے۔کبھی ایڑیوں پر گھومنے کے بارے میں نہیں سوچا۔ایک بار بھٹو مرحوم کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی۔ہماری رائے پوچھی گئی تو ہم نے کہا۔بھٹو مرحوم کی مخالفت کے باوجود یہ تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ پیامبر شعور تھے۔انہوں نے عوام کو سیاسی شعور دیا۔یہ سن کر رانا جی بھڑک اٹھے اور کہا کہ حسنی صاحب یہ بات لکھ کر دے دو۔ہم نے کہا کہ ہر بات لکھنا ضروری نہیں۔کامن سینس بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔فاروق عمر نے وقت کی پابندی عمر بھر کی ہے۔ہر تقریب میں سب سے پہلے پہنچا کرتے تھے۔اسی لیے احباب واقارب وقت کا جنونی کہا کرتے تھے۔مزے کی بات ہے کہ موصوف اپنی شادی خانہ آبادی کے موقع پر بھی اس جنون سے دست بردار نہ ہوئے۔لڑکی والوں سے شادی کارڈ پر آمد برات کا وقت ساڑھے بارہ بجے لکھا تھا۔سہرا بندی کے دوران گھڑی پر نظر پڑی تو یکا یک کھڑے ہو گئے اور پوچھا۔گاڑی آ گئی ہے۔جواب ملا۔دروازے پر کھڑی ہے۔فوراً گاڑی میں جا بیٹھے۔گھر والوں نے کہا۔ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ذرا صبر کرو آج دلہن لے آئیں گے۔کہنے لگے اگر استاد ہی وقت کی پابندی نہ کرے تو پھر کون کرے گا؟؟؟ دو چار مہمان موجود تھے انہیں کار میں بٹھایا اور ہونے والی بیگم کے گھر کا رخ کیا۔وہاں پہنچے تو ٹینٹ اور کرسیاں لگائی جا رہی تھیں۔مہمانوں کا دور تک کوئی اتا پتا نہ تھا۔لڑکی والے بھاگے بھاگے آئے اور اس جلد بازی کا سبب پوچھا۔موصوف نے شادی کارڈ آگے کر دیا اور کہا کہ آپ نے بارہ بج کر تیس منٹ کا وقت دیا تھا۔وقت پر پہنچنا ضروری تھا۔ڈیڑھ بجے تک براتی بھی پہنچ گئے۔ولیمہ کے موقع پر بھی

وقت کی پابندی نے اپنا رنگ جمایا۔لذت کام ودہن کیلئے ایک بجے کا وقت مقرر کیا گیا تھا۔سو، وقت پر کھانا شروع کرادیا۔عزیز واقارب نے مشورہ دیا کہ مہمانوں کو آنے دو کھانا خراب نہیں ہوگا۔خانہ خرابی کا جواز پیدا ہوجائے گا۔کہنے لگے جو مہمان آ گئے ہیں، انہیں انتظار کی کوفت میں کیوں مبتلا کیا جائے۔انہوں نے وقت پر آ کر کوئی جرم نہیں کیا کہ انہیں سزا دی جائے۔کھانا لگا دیا ور پھر جو آتا گیا کھاتا گیا۔

فاروق عمر......عمر کے اس حصے میں ہیں جہاں آدمی اپنا مستقبل بھی با آسانی دیکھنے سے بہرہ مند ہوجاتا ہے۔مگر موصوف نے یہاں بھی اپنی انفرادیت برقرار رکھی۔ان کے شب و روز کی کارکردگی دیکھ کر لگتا ہے کہ وہ فرقوں کی اہمیت اوران کی ضرورت سے کچھ زیادہ ہی آگاہ ہو گئے ہیں۔سو،آگاہی کا عذاب جھیل رہے ہیں۔

عہد جوانی میں سیاسی اور مذہبی جماعتوں کو قومی انتشار کا سبب قرار دیا کرتے تھے۔اب فرقہ ملامتیہ کے رکن بن گئے ہیں۔فرقہ ملامتیہ پر عمل پیرا ملامت سے کبھی آزردہ خاطر نہیں ہوتے البتہ تعریف وتوصیف طبیعت پر گراں گزرتی ہے۔ان کی ملنساری کبھی قابل تحسین ہوا کرتی تھی۔ اب کہیں جانا تو دور کی بات ہے۔ملنا جلنا بھی موقوف کر رکھا ہے۔کچھ عمر کا تقاضا اور کچھ بیماریوں کی کارستانی نے بستر سے لگا رکھا ہے۔یہ ''کچھ کچھ'' بھی آدمی کو کہیں کا نہیں رکھتا۔جوانی ہو یا بڑھاپا آدمی کو بستر سے لگا دیتا ہے۔نرم وگداز بستر جو سب سے بڑی راحت ہوا کرتا تھا،اب کمبل بن چکا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ فلم اور ڈرامہ دیکھ کر رونے والوں پر ہنسا کرتے تھے اور اب یہ حال ہے کہ خبریں سن کر بھی زاروقطار رونے لگتے ہیں۔سارا دن آنسوؤں کے سیلاب میں غوطے لگاتے رہے ہیں۔

خودساز

خاکہ

سعید احمد

ناصر حسنی

پندرہ روزہ ''حقیقت'' کے پبلشر اور ایڈیٹر سعید احمد کو قد وقامت کے حوالے سے ''بوٹا ساقد'' کا مالک نہیں کہا جاسکتا کہ کسی بھی باریش مرد کی قد وقامت کو ''بوٹا'' سا کہا جائے تو اس کی مردانگی پر بڑی زبردست اور بھاری ضرب پڑتی ہے، بوٹا ساقد تو کسی قیامت خیز، فتنہ انداز حسینہ ہی کا ہوسکتا ہے تاہم یہ کہنے میں کوئی قباحت، کوئی مزائقہ نہیں کہ سعید احمد قد وقامت کے اعتبار سے ایسے لحیم شحیم تو نہیں کہ انہیں بلند قامت کہا جائے مگر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ان کا قلم خاصا بلند قامت ہے! اب یہ فیصلہ تو کوئی ناقد ہی کرسکتا ہے کہ ان کے قلم کی بلند قامتی اشتہار کی طلب کو ظاہر کرتی ہے یا ان کی نگارشات کی سربلندی کو۔ پندرہ روزہ ''حقیقت'' کے چیف ایڈیٹر امجد قریشی مرحوم نے ایک بار کہا تھا: ''بہاول پور سے چار قلم کاروں امجد قریشی، ناصر حسنی، سعید احمد اور ظہور آثم نے ڈیکلریشن لیا تھا مگر ہم تینوں بری طرح ناکام ہوئے مگر اچھی بات یہ ہے کہ سعید احمد کامیاب رہا۔'' جواباً ہم نے کہا تھا کہ جو اچھی طرح زندگی نہ گزار سکے وہ اچھی طرح کسی بھی میدان میں کامیاب نہیں ہوتا۔ سعید احمد نے پندرہ روزہ ''حقیقت'' کا اجراء کیا اور شب وروز محنت اور شوق کی بناء پر اسے ایک قابل توجہ اور لائق مطالعہ جریدہ بنا دیا۔ امجد قریشی کے جنت مکانی ہونے کے بعد موصوف نے بے باکیاں کی جگہ ملکی سیاسیات کا اعلان کیا اور باقاعدگی کے ساتھ ملکی سیاسیات پر تبصرہ کررہے ہیں۔

سعید احمد کو خاک سے بہت ڈر لگتا ہے بارہا کہہ چکا ہے میرا خاکہ لکھو تو خاک مت اڑانا اور ہم جواباً کہا کرتے تھے کہ خاک نشینوں کو خاک سے ڈرنا نہیں چاہتے کہ ان کے پاس خاک کے سوا کچھ نہیں ہوتا یوں بھی انسان خاک نشینی سے دستبردار ہوجاتے تو رزق خاک ہوجاتا ہے۔

سعید احمد نے نہ صرف ہم نام ہے، بلکہ ہم کام بھی۔ہم نے صحافتی زندگی کا آغاز بھی ایک ساتھ ہی کیا تھا۔

جنرل ضیاء الحق کے دور میں ڈیکلریشن کی لوٹ سیل لگی تو سعید احمد نے پندرہ روزہ ''حقیقت'' کا ڈیکلریشن لیا اور ہم نے ماہنامہ عوامی ادب کا مگر حالات کی گردش ہمیں کراچی لے گئی جہاں روزنامہ ''جنگ''، ''حریت'' اور ''جسارت'' جیسے قومی اخبارات کے ساتھ مختلف ڈائجسٹوں میں کام کرنے کے مواقع ملے۔ یوں ماہنامہ ''عوامی ادب'' ہماری عدم الفرصتی کی بھینٹ چڑھ گیا۔

یہ کہنا بڑا رسمی سا لگتا ہے کہ سعید احمد بہت محنتی انسان ہیں تاہم یہ کہنے میں کوئی مذائقہ نہیں کہ وہ ایک خودساز شخص ہیں اوران کی خوشحالی اور باعزت زندگی خودسازی کا ثمر ہے۔اب ہمیں یہ تو معلوم نہیں کہ موصوف کون کون سے ساز بجا سکتے ہیں لیکن یہ بات پورے یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے خودی کے ساز کو بڑی مہارت اور لگن سے بجایا ہے۔سعید احمد نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز روزنامہ ''کائنات'' اور ''سیادت'' بہاول پور سے کیا تھا۔کہتے ہیں مرد کی کامیابی کے پیچھے کسی عورت کا ہاتھ ہوتا ہے مگر سعید احمد کی کامرانی اور کامیابی کے پیچھے ایک مرد کا ہاتھ ہے۔یوں بھی محنت اور لگن اسی وقت باثمر اور بامراد ہوتی ہے۔ جب خوش نصیبی کے ساتھ کوئی خوش مزاج، خوش خلق، اور خوش آداب شخص بھی میسر آجاتے خواہ وہ عورت ہو یا مرد۔سعید احمد کی خوش نصیبی یہ ہے کہ انہیں عبدالحمید شہباز جیسا شاہین صفت استاد کی قربت نصیب ہوتی اور شہباز مرحوم نے تربیت کا حق ادا کر دیا۔استاد شہباز مرحوم کے ساتھ ہم نے روزنامہ ''دستور'' بہاول پور میں کام کیا ہے۔بہت شفیق اور مہربان طبع تھے۔انہوں نے ہمیں چار کالمی، پانچ کالمی اور چھ کالمی خبر کی سرخی بنانے کا آسان طریقہ بناتے ہوئے کہا تھا کہ کاتب کو خبر کی سرخی دینے سے قبل الفاظ گن لیا کرو۔ یہ نصیحت ایسے زوداثر ثابت ہوتی کہ کبھی کاتب کو شکایت کرنے کا موقع ہی نہ ملا۔

یہ کئی عشروں پہلے کی بات ہے اس وقت کمپیوٹر عام نہیں ہوا تھا۔ہاں خوب یاد آیا۔ہم

کراچی گئے اور روز نامہ ''حریت'' سے بحیثیت کالم نگار وابستہ ہو گئے۔ پہلا کالم شائع ہوا جو نامکمل تھا ہم نے اس کا بقیہ ڈھونڈنے میں پورا اخبار چھان مارا لیکن بقیہ نہ ملا۔ پیسٹر سے شکایت کی تو اس نے کہا۔ حریت میں کالم کا بقیہ شائع کرنے کی روایت نہیں۔ آپ خوش نصیب ہو کہ نصر اللہ خان کی جگہ شائع ہو رہے ہو لیکن یاد رکھیں کہ کالم اٹھارا سینٹی میٹر ہی ہو۔ یہاں ہمیں استاد شہباز مرحوم کا فارمولہ یاد آ گیا، اپنے کالم کی سطور یاد کر لیں پھر اس کے بعد کوئی دشواری نہ ہوئی۔ سعید احمد نے خبر نگاری پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ اپنی محنت اور لگن سے آگے بڑھتے رہے۔ روز نامہ ''جسارت'' کراچی سے وابستہ ہوئے تو انٹرویو بھی لکھتے تو اور حق تو یہ ہے کہ حق ادا کر دیا۔ ان دنوں پندرہ روزہ ''حقیقت'' کے خود ساز ہیں اور خود ہی گیت ہیں۔

شاد باد

خاکہ

پنوں ذادہ شاد

ناصر حسنی

ناصر حسنی کہتے ہیں، ادیب اور شاعر ادب کی روح ہوتے ہیں۔سو یہ تسلیم کرنے میں کوئی قباحت نہیں کہ پنوں ذادہ شاد روح ادب ہیں روح اچھی بھی ہوتی ہے اور بری بھی ہوتی ہے۔ بری روح آسیب کی دنیا کی باسی ہوتی ہے۔اب یہ ایک بات ہے کہ باسی کڑی میں ابال نہیں آتا مگر شاعر اور ادیب جوں جوں باسی ہوتا ہے اس میں ابال اتنا ہی زیادہ آتا ہے۔

پنوں ذادہ شاد سرائیکی کے شاعر ہیں بلکہ کچھ زیادہ شاعر ہیں بہت سی کتب کے مصنف ہیں اور ان کی ذود گوئی ضرب المثل ہے۔

ڈپٹی ڈائریکٹر تعلقات عامہ رحیم طلب کا کہنا ہے کہ پنوں ذادہ شاد جب خوش باش اور شاد باد ہوتے ہیں تو گفتگو بھی شاعری میں کرتے ہیں سامع یا مخاطب جب جی جی کرتے کرتے تھک جاتا ہے تو سر ہلانے ہی میں عافیت سمجھتا ہے۔دروغ بر گردن رحیم طلب۔

رحیم طلب یہ بھی بتاتے ہیں کہ شاد پنوں ذادہ نہیں بلکہ نفس بہ نفیس پنوں ہیں اور اپنی سسّی کو منانے کیلئے شاعری کرتے ہیں اور بے تکان شاعری کرتے ہیں مگر مشکل یہ آن پڑی ہے کہ سسّی کو سرائیکی نہیں آتی اور ہمارے عہد کے پنوں کو بلوچی نہیں آتی۔

پنوں ذادہ شاد کو دیکھ کر ہمیں کسی دانش ور کا یہ قول یاد آجاتا ہے کہ انسان جہاں ختم ہوتا ہے وہاں سے شاعر کا آغاز ہوتا ہے سوال یہ ہے کہ انسان ختم ہو کر شاعر بن جاتا ہے تو کیا۔وہ آدمی بھی رہتا ہے یا نہیں مگر یہ طے ہے کہ آدمی کیلئے شاعر ہونا بڑے اعزاز کی بات ہے اور اس سے بھی بڑی بات شاعر کا انسان ہونا ہے۔

عام مشاہدہ یہ ہے کہ بعض شاعر انسانیت کی سطح سے اتنے گر جاتے ہیں کہ انسان ہی

نہیں رہتے انسان کا سایہ بن جاتے ہیں۔ یہ کیسا المیہ ہے یہ کیسی بدنصیبی ہے کہ وطن عزیز میں شاعر انسانیت کے درجے سے بلند ہو کر بھی کسی شجر سایہ دار کا متمنی ہوتا ہے کہتے ہیں پوت کے پاؤں پالنے میں نظر آتے ہیں۔ ہم نے ایسا کوئی بچہ نہیں دیکھا جو بغیر پاؤں کے پیدا ہوا ہو۔ پنوں ذادہ بھی دو پاؤں لیکر پیدا ہوئے تھے مگر یہ معاملہ تحقیق طلب ہے کہ ان کے والدین نے اپنے نوزائیدہ پوت کے پاؤں پالنے میں دیکھے تھے یا جھولے میں ہے۔

گئے زمانے بھی کیا خوب تھے شاعری جس کے پیچھے پڑ جاتی تو رد بلا کا ہر تعویز کا غذ کا ٹکڑا ثابت ہوتا اور شاعر مال وزر کے حصول کے ذرائع کی تلاش میں دنیا بھر کی خاک چھان مارتا آج کے دور میں آدمی شاعری کے پیچھے اور شاعر مال وزر کے پیچھے ہوتا ہے۔ انجام کار دونوں سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ خدا ملتا ہے نہ وصال صنم مگر یہ کوئی کلیہ نہیں۔ کوئی رجسٹرڈ فارمولا نہیں بعض اوقات خدا بھی مل جاتا ہے اور صنم بھی بغل سے جھانکتا رہتا ہے اور یہ تاک جھانک دونوں کیلئے بار آور ہوتی ہے۔ کبھی کبھی کسی ایک پر بار بھی بن جاتی ہے۔

کہتے ہیں شاعر آرام پسند اور سست الوجود ہوتے ہیں۔ خودی کو بلند کرتے کرتے خود پاتال میں اتر جاتے ہیں۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ صرف شاعری کریں، کمائی کوئی اور کرے۔ اعزازیے اور وظیفے کے نام پر اتنے پیسے مل جائیں کہ گھر کا چولہا گرم رہے۔ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ جن کا چولہا گرم رہتا ہے، ان کا دماغ ٹھنڈا رہتا ہے۔ کبھی کبھی تو ہم سوچتے ہیں کہ ہم ریاستی دور میں پیدا کیوں نہ ہوئے۔ بھاگ دوڑ کر کے وظیفہ لگوانے اور مرغن غذائیں کھا کر حقہ لاحول ولا قوت۔ کس آؤٹ آف فیشن چیز کا نام زبان پر آ گیا۔ شیشہ پیتے اور شیشہ گری کرتے حقے کا زمانہ تو گزر چکا ہے۔

خوشی کی بات یہ ہے کہ پنوں ذادہ شاد کو کسی ریاست نے وظیفہ نہیں دیا ورنہ وظیفہ خور شاعروں میں ایک اور وظیفہ خور کا اضافہ ہو جاتا۔ اکادمی ادبیات، اسلام آباد پاکستان نے غالباً سات ہزار روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ڈائریکٹر قاسم جوکھیو اور اسسٹنٹ

ڈائریکٹر مہر نواز سولنگی ادیب پرور ہیں، ادب شناس ہیں، ادیبوں اور شاعروں کی سماجی حیثیت نہیں دیکھتے ان کی شاعرانہ اور ادیبانہ حیثیت دیکھتے ہیں ان کی مالی حیثیت دیکھتے ہیں۔ ایسے ادیبوں اور شاعروں کی بھی کمی نہیں جو لاکھوں روپے تنخواہ لیتے تھے۔ اب ہزاروں روپے ماہانہ پنشن لے رہے ہیں مگر ان کی کوششوں اور خواہش یہی ہوتی ہے کہ تن خواہی کیلئے اکادمی ادبیات اسلام آباد انہیں آباد رکھے۔

سنا ہے اسسٹنٹ ڈائریکٹر میر نواز سولنگی، لنگی والوں سے مرعوب نہیں ہوتے وہ مہر نوازی کے بجائے غریب نوازی اور ادیب نوازی کو ترجیح دیتے ہیں۔ اور قاسم جوکھیو تقسیم کے قائل ہیں۔ بانٹنے کے نہیں سو، اکادمی ادبیات بندر بانٹ سے محفوظ ہے مگر کب تک...... لنگی پھر پرچم بن کر لہرانے لگے اور ہم اجرک سنبھالتے رہ جائیں۔

بہاول پور ادبی حوالے سے بہت توانا ہے۔ اپنے شاعروں، ادیبوں اور فنکاروں کی توقیر بھی بہت کرتا ہے مگر بدنصیبی یہ ہے کہ یہاں کے منتخب نمائندوں کی ترجیحات مختلف ہیں۔ حزب اقتدار میں ہوں تو عوام سے اختلاف کرتے ہیں۔ حزب اختلاف میں ہوں تو صاحبان اقتدار سے اختلاف کرتے ہیں۔

اکادمی ادبیات اسلام آباد پاکستان کا سب آفس بہاول پور میں بھی ہونا چاہیے مگر چاہت کیلئے عوامی نمائندوں کی چاہت درکار ہے۔ خدا جانے شہر ظہور نظر کو اس کا حق کب ملے گا اور یہ حق کون دلائے گا۔

ہونہار

خاکہ

عبدالخالق قریشی

ناصر حسنی

ہونہار پروا کے چکنے پات دیکھ کر والدین کی آنکھوں میں جو چمک پیدا ہوتی ہے وہ قابل دید ہوتی ہے مگر جب ہونہار پروا کے ہاتھ بھی چکنے ہوں تو والدین کی آنکھوں میں فکر مندی کے سائے لہرانے لگتے ہیں۔عبدالخالق قریشی کی چٹی رنگت اور گداز جسم دیکھ کر والدین پھولوں نہ سمائے تھے مگر اس کے ہاتھوں کی چکناہٹ دیکھ کر فکر مند بھی رہا کرتے تھے ہر چیز اس کے ہاتھوں سے ریت کی طرح پھسل جاتی ہے۔

قریشی صاحب دوسروں کو کھاتے دیکھ کر خوش ہوتے ہیں ان کو ہنستے مسکراتے چہرے بہت اچھے لگتے ہیں۔اسکول لائف میں اپنا جیب خرچ بھی دوسروں پر خرچ کر دیا کرتے تھے۔

عام مشاہدہ ہے کہ لوگ سیاست سے ادب کی جانب آتے ہیں تا کہ میڈیا اور دیگر ذرائع ابلاغ سے تعلقات خوشگوار ہیں اور دید ولحاظ کا رشتہ بھی مستحکم ہوتا رہے۔عبدالخالق قریشی نے سیاست کی چھتری سے صحافت کی جانب اڑان بھری اور پہلی ہی پرواز میں بہت سا فاصلہ طے کر لیا۔ہمیں یقین ہے کہ ان کی اڑان پی آئی اے کی پرواز ثابت نہیں ہوگی کیونکہ وہ سیاست سے غائب ہو چکے ہیں۔شنید ہے ان کے پیرومرشد نے بیعت لینے سے قبل یہ عہد لیا تھا کہ توبہ کو بچوں کا کھیل مت بنانا،توبہ سچی ہو تو آدمی ارتداد کا مرتکب کبھی نہیں ہوتا۔توبہ کر کے تائب ہونا اور تائب ہو کر توبہ کو توڑنا اللہ سے مذاق کرنے کے مترادف ہے۔قریشی صاحب نے زبانی کلامی اظہار کو ترک کر کے قلم سنبھالا تو پہلے پہل مضامین پر طبع آزمائی کی اور پھر ایک نئی راہ اختیار کی۔ بہاول پور شاعروں اور کالم نگاروں کے معاملے میں خاصا خودکفیل ہے اور یہ کفالت عربی کفیلوں کی طرح ہے۔ایسے ایسے خرانٹ پڑے ہیں جنہوں نے عمر بھر خرانٹیں بھرنے کے سوا کچھ نہیں کیا اور نئے

آنے والوں کی ٹانگیں کھینچنا ہی ان کا مسلک رہا ہے۔سو،قریشی صاحب نے انٹرویو لینے ہی کو بہتر سمجھا اس طرح وہ شاعروں اورادیبوں کے باطن میں جھانکنے میں کامیاب ہو گئے کبھی کبھی انٹرویو لینے کے بعد خاصے بدمزا دکھائی دیتے ہیں۔شاید اونچی دکانوں پر پھیکا پکوان کھا کر بدمزا ہو جاتے ہیں۔

قریشی کی انٹرویونگاری میں انٹری بڑی دھما کا خیز ثابت ہوئی بہت سے چہرے بے نقاب ہوتے مگر یہ کوئی انہونی بات نہیں جس طرح سیاست میں سینٹر کی قوت کو کمک کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور پھر ٹشو پیپر کی طرح پھینک دیا جاتا ہے۔ادب میں بیوروکریٹ بھی تیسری قوت بنتے رہتے ہیں اور جب سبک دوش ہوتے ہیں تو دوشی ٹھہرائے جاتے ہیں۔

ایک ہمہ جہت ادیب کا انٹرویو پڑھ کر ہم نے قریشی صاحب سے کہا۔مضامین میں نثری کی پچ لگانے کی کیا ضرورت تھی۔ترنت بولے۔میں جملوں کا میک اپ تو کرسکتا ہوں۔لفظوں کی پلاسٹک سرجری نہیں کرسکتا جو کچھ موصوف نے کہا تھا میں نے لکھ دیا۔

خدمت خلق قریشی صاحب کے خمیر میں شامل ہے۔سعودی عرب گئے تو وہاں پر صاحب حیثیت ہم وطنوں کے تعاون سے ایک فلاحی انجمن بنائی اور غریب الوطنی میں جلا وطنی کا عذاب سہنے والوں کی ضروریات کی تکمیل اوران کی پریشانیوں کا حل تلاش کرتے رہے۔

کئی برس وہاں رہے، والدہ کی بیماری کی اطلاع ملی تو بوریا بستر لپیٹے بغیر بہاول پور آ گئے۔

ذیابیطس بیماری ہی نہیں ایک مصیبت ہے اور مصیبت کبھی اکیلی نہیں آتی۔ذیابیطس نے قریشی صاحب کو ہدف بنایا تو دل بھی ذیابیطس کا ساتھی بن گیا۔دھوکا کھانا آدمی کی مرغوب غذا ہے۔دل دھوکا دے تو آدمی ٹوٹ جاتا ہے مگر دل کی تخریب کاری میں تعمیر کا پہلو بھی ہوتا ہے جو لوگ تصویر کے دوسرے رخ پر توجہ دیتے ہیں۔دنیا کی نظریں ان پر مرکوز ہو جاتی ہیں۔

قریشی صاحب نے تصویر کے دوسرے رخ پر توجہ دی اور ڈاکٹر منیر چوہدری کے

کلینک کو اپنا ڈیرا بنا لیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ان کے جذبہ خدمت خلق سے متاثر ہو کر ذیابیطس کی ابتدائی تربیت کا اہتمام کیا اور قریشی صاحب شوگر ڈسپنسری چلانے کے اہل ہو گئے۔

ہمیں حیرت ہے کہ ایک ن لیگ میں عمران خان کی تھوڑی بہت مماثلت پائی جاتی ہے۔ عمران خان سماجی رہنما سے سیاسی رہنما بنے۔ قریشی صاحب نے سیاسی خدمات ترک کر کے سماجی خدمت کو اپنا شعار بنایا۔ عمران خان نے والدہ کے انتقال کے بعد شوکت خانم ہسپتال قائم کیا جو کینسر کے مریضوں کیلئے نوید کا پیغام لایا۔ قریشی جی نے والدہ کی رحلت کے بعد شوگر کے مریضوں کیلئے شوگر فری ڈسپنسری قائم کی، دونوں کی والدہ کا انتقال کینسر کے باعث ہوا۔

ڈاکٹر منیر چوہدری کے تعاون سے شوگر کے مریضوں کا علاج شروع کیا۔ قریشی صاحب خود بھی شوگر کے مریض ہیں، سو اس موذی مرض کے جور وستم سے خوب آگاہ ہیں۔ قریشی جی کا تعلق صاحب حیثیت خاندان سے ہے اللہ نے خوش حالی کے ساتھ توفیق کی نعمت سے بھی نوازا ہے۔ شوگر فری ڈسپنسری کا آغاز اٹھارا مریضوں سے کیا گیا تھا جس کی تعداد اب سینکڑوں تک پہنچ گئی ہے۔ اخراجات کی مد میں ساٹھ فیصد قریشی صاحب کے ایک عزیز اور چالیس فیصد ڈاکٹر منیر چوہدری دیتے ہیں۔ مخیّر حضرات بھی اپنی حیثیت کے مطابق اس کار خیر میں حصہ لیتے رہتے ہیں۔

چند دن قبل ہماری بینائی دھندلانے لگی، ڈاکٹروں کے مشورے پہ شوگر ٹیسٹ کرایا تو یہ بھیانک حقیقت علم میں آئی کہ ہم بھی شوگر کے یرغمالی بن چکے ہیں۔ قریشی کو رپورٹ دکھائی تو کارڈ بنایا، یوں ہم بھی شوگر فری ڈسپنسری کے ممبر بن گئے۔ قریشی صاحب نے ایک ہفتے کی دوا دی اور ایک گولی کھلا کر ایک لیکچر پلایا، جس کا لب لباب یہ ہے کہ شوگر کی بیماری کا ابھی تک کوئی علاج دریافت نہیں ہوا ہے۔ اس لیے شوگر نارمل رکھنے اور اس کے مضر اثرات سے بچنے کیلئے پرہیز بہت ضروری ہے۔ شوگر سے محفوظ رہنے کیلئے شوگر سے دور رہو۔ ہم نے کہا قریشی صاحب! کیسے دور رہوں چائے کی پیالی خالی ہو تب بھی اس کی طرف ہاتھ خود بخود بڑھنے لگتا ہے۔ کہنے لگے۔

جی صاحب! آپ کو صبر کرنا ہوگا۔

قریشی صاحب آپ بھی عجیب آدمی میں شوگر سے بچنے کی ہدایت کرر ہے ہواور صبر کی تلقین بھی کرر ہے ہوحالاں کہ صبر کا پھل بہت میٹھا ہوتا ہے۔

صاحب! صبر کا عمل ہی وہ واحد پھل ہے جسے آپ جی بھر کر کھا سکتے ہیں۔

قریشی صاحب نے شوگر پر کنٹرول کرنے کیلئے مختلف ہدایات کیں جس سے ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ شوگر ایسی بیماری ہے جو مریض سے کہتی ہے۔ جا! بیٹا جتنا بھی جی چاہے، جی لے تجھے موت کا بلاوا اس وقت تک نہیں آئے گا۔ جب تک تو موت کو نہ بلائے۔

ان کی ہدایات پر عمل کر کے ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ گندم انسان کا ازلی اور ابدی دشمن ہے۔اس نے آدم کو جنت سے نکالا اور آدم وزادوں کو دنیا سے نکال رہا ہے۔سو،شوگر کے مریضوں کیلئے ضروری ہے کہ گندم کم سے کم اور چنا زیادہ سے زیادہ کھائیں مگر اتنا کھائیں کہ پیٹ نہ بھرے ہم نے گندم کے ساتھ چینی کا استعمال بھی کم کر دیا ہے اور اب شوگر کم بینائی بہتر ہو رہی ہے۔ ذیابیطس ایک جان لیوا بیماری ہے مگر انتہائی سبق آموز ہے یہ اپنے ہدف کو باور کراتی ہے کہ زندہ رہنے کیلئے کھانا ضروری ہے کھانے کیلئے زندہ رہنا ضروری نہیں سو، اب ہم زندہ رہنے کیلئے کھاتے ہیں۔

روہی کا مجذوب

خاکہ

فضل حمید

ناصر حسنی

جسم گداز مگر گول مٹول نہیں۔ روشن چمکدار آنکھیں جو ذہانت کی غماض ہیں۔ مناسب قدو قامت نہ لمبا نہ چھوٹا، البہ بوٹا سا کہا جا سکتا ہے۔ مشابہت کسی بوٹے سے دی جائے، یہ دیکھنے والے کے حسن نظر پر منحصر ہے۔ نام فضل حمید ہے مگر کسی کو یہ علم نہیں کہ اضافت کا مطلب کیا ہے اور یہ وضاحت کیوں ضروری ہے اس اعتبار پر اسرار شخصیت کہا جا سکتا ہے۔ بچپن میں بچوں کی کہانیاں بھی لکھیں۔ علی احمد رفعت نے پوت کے پاؤں پالنے میں پہچان لیے تھے، سوستلج کے دروازے وا کر دیے ساتھ رہنے سے فطری جوہر کھلے تو فرزند نسبتی کے اعزاز سے نواز دیا۔ خالدہ رفعت کا ساتھ ملا تو صلاحیتوں میں نکھار آنے لگا۔ لکھنے لکھانے کی مشق جاری رہی رائٹر تو نہ بن سکا ایڈیٹر بن گیا۔ ہفتہ وار ستلج ڈیلی ستلج ہو گیا۔ بہاولنگر اور لودھراں سے بھی شائع ہونے لگا۔

جب تک فضل حمید سے ذاتی طور پر متعارف نہیں ہوا تھا میرے ذہن میں عام تاثر کے سبب اس کا جو نقشہ بنا تھا وہ ایک دہشت گرد کا سراپا تھا میں فضل حمید کو ایک ایسا ہیبت ناک آدمی سمجھتا تھا جو صحافی کا لبادہ اوڑھ کر معززین کے گریبان چاک کرتا اور شریفاء کی پگڑیاں اچھالتا اور جب ادیب کی جون میں آتا تو حرف و معنی کی دھجیاں ادھیڑتا مگر جب میری اس کی شناسائی ہوئی تو وہ مجھے ایک ایسا شاعر دکھائی دیا جس کو محترمہ نسرین راؤ بھی وچارا کہتی ہیں۔

باغبانپورہ میں منعقد کئے جانے والے پیپلز پارٹی کے ایک جلسے کا اسٹیج جب تیار ہو گیا تو بیگم نسرین راؤ رشید جلسہ شروع ہونے سے ایک گھنٹہ قبل ایک نشست پر براجمان ہو گئیں اور اسٹیج پر آنے والے ہر آدمی سے راؤ صاحب کے انداز میں تفتیش کرنے لگیں ایک بندہ اوپر آنے لگا تو بیگم نے پوچھا۔

یہ کون اے؟

شاعر ہے کس کارکن نے جواب دیا۔

اچھا اچھا! وچارا شاعر اے، تے آن دیو

اسی دوران یہ تجربہ بھی ہوا کہ مقامی اخبارات میں جیون بھوگ کر نروان پانے والے ان بیگار کیمپوں کو قومی ناسور قرار دیتے ہیں مگر جب ان کو برتا جائے نزدیک رہ کر ان کی زندگی کا مشاہدہ کیا جائے ان کے ساتھ کام کیا جائے تو وہ لوگ اندر سے ایک مکمل اور بھرپور خرکار ثابت ہوتے ہیں ان کی خوشحال اور آسودہ زندگی کا دارومدار لفافہ صحافت پر ہوتا ہے یہ خوش لباس لوگ اندر سے کسی جذامی کی طرح داغدار ہوتے ہیں اور اپنے داغدار چہرے کو چاند کے داغ سمجھ کر اپنے حال میں مست رہتے ہیں سرکاری افسران کی کرپشن میں ان کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ نرم مزاج افسروں کی گردن پر یہ لوگ پیر تسمہ پا پن کو سوار ہو جاتے ہیں۔

ہم جب بھی فضل حمید کی صحبت سے فیض یاب ہوئے ہمیں وہ لکھنوی حضرات بہت آئے جو کسی بھی صورت میں یہ ماننے پر آمادہ ہی نہیں ہوئے تھے کہ اہل رام پور کے مسلک میں بات بنتی ہی نہیں گالیاں دیئے بغیر مگر جب اس لکھنوی کا ایک رام پوری سے واسطہ پڑا تو اس کو باور کرنا ہی پڑا کہ اگر آدمی چاہے تو شاعری کی طرح گالیوں میں بھی گفتگو کر سکتا ہے اسی طرح ہمیں بھی فضل حمید سے مل کر اس کی فرہنگ فحش بات پر ایمان لانا ہی پڑا۔ اس کی فحش کلامی ایک ایسی خوش کلامی کا آہنگ رکھتی ہے جو مخاطب اور سامع پر یک گونہ خوشی کی کیفیت طاری کر دیتی ہے یہاں یہ وضاحت بے جا نہ ہوگی کہ یہ حضرت خوش کلام بہاول پور کی نامور اور پہلی کالم نگار خاتون محترمہ خالدہ رفعت کے شوہر و مدار ہیں معاف کرنا شوہر نامدار ہیں۔

شنید ہے کہ تیکھے نقوش اور بوٹا سا قد رکھنے والا یہ شخص اردو ادب میں ایم اے ہے اور اب فحش کلامی پر میس لکھ کر گالیات کے موضوع پر پی ایچ ڈی کرنے کا تہیہ کئے ہوئے ہے بس جوش قدح میں جشن چراغاں کی دیر ہے نام ہر شخص کا ذاتی مسئلہ ہے اس لئے کسی کے نام پر معترض ہونا

ذاتیات پر حملہ آور ہونے کے مترادف ہے چونکہ فضل حمید کا تعلق صحافت سے ہے اور ہمارے ہاں صحافت و دیگر فنون کو پبلک پراپرٹی تصور کیا جاتا ہے اس لئے ان شعبوں سے تعلق رکھنے والے اشخاص ازالہ حیثیت عرفی جیسے مقدمات کا حق محفوظ نہیں رکھتے سو یہ افراد انتہائی غیر محفوظ ہوتے ہیں۔

ہمیں اس کے فضل حمید کہلوانے پر اعتراض ہے اور ہم بجا طور پر اس سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ اپنے اخبار میں درستگی نام کا اشتہار ضرور چھپوائے گا۔ جس کا متن ہوگا کہ کتابت کی غلطی سے میرا نام فضل حمید لکھا اور پکارا جاتا رہا ہے مگر اب جبکہ میں جسمانی اور ذہنی اعتبار سے بالغ اور تھوڑا سا بلیغ بھی ہو چکا ہوں، کاتب کی اس غلطی کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہوں اور ہم ڈنکے کی چوٹ پر نامنظور کی گردان پڑھتا ہوں لہٰذا آئندہ مجھے فضل حمید کے بجائے فضل رفعت لکھا اور پکارا جائے واضح ہو کہ اس اشتہار پر عمل نہ کرنے والوں پر دیوانی مقدمہ درج کر کے ان کو دیوانی عدالت کے چکر پہ چکر لگوا کر دیوانہ بنانے کا حق محفوظ رکھتا ہوں۔

آدمی اور اونٹ میں ایک قدر مشترک یہ ہے کہ اونٹ مستی کے عالم میں بڑبڑاتا ہے۔ اور آدمی مستی کی کیفیت میں مبتلا ہو جائے تو بڑبڑاتا ہے فضل حمید پر بھی اکثر و بیشتر بڑبڑاہٹ کے دورے پڑتے رہتے ہیں ایک بار وہ مجھ سے کہنے لگا۔ ناصر صاحب کھسک لو ورنہ زاہد شب بیدار کی طرح آپ کو ساری رات جاگنا پڑے گا بڑے زور کی بارش آنے والی ہے۔

ابر کی غیر موجودگی میں بارش کی پیش گوئی مجذوب کی بڑ ہی سمجھی جا سکتی ہے میں بھی اس کو مجذوب کی بڑ ہی سمجھا تھا مگر وقت سے پہلے گھر پہنچنے کے تصور نے مجھے دفتر کی سیڑھیاں اترنے پر مجبور کر دیا اور جب میں گھر پہنچا تو کچھ دیر بعد بارش ہونے لگی کبھی کبھی موسم کا حال بتانے والے بھی تو درست پیش کر دیتے ہیں اور بڑبڑاہٹ پیش گوئی بھی بن جاتی ہے جس طرح ہر بڑبڑانے والا اونٹ مست نہیں ہوتا اس طرح ہر بڑبڑانے والا بندہ مجذوب نہیں ہوتا۔

فضل حمید کا شمار بہاول پور کے اعلیٰ تعلیم یافتہ صحافیوں میں ہوتا ہے وہ بدکلام ہے بدنیت

نہیں یہی وجہ ہے کہ ریڈیو بہاول پور سے پیش ہونیوالے حالات حاضرہ کے پروگرام میں اس نے رٹا رٹایا سبق کبھی نہیں سنایا حالانکہ اس پروگرام میں آنے والے اکثر صحافی ایسے ہوتے ہیں جو ایک پیراگراف بھی لکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ وہ مختلف اخبارات میں چھپنے والے مضامین کی نوچار ناچی سے اپنی صحافت کی ساکھ رکھے ہوئے ہیں۔

گھر داماد ہونا ہمارے معاشرے میں اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ مزاحیہ ادب حتیٰ کہ فکاہی کالموں میں بھی گھر دامادوں کے خوب لتے لئے جاتے ہیں مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ دوسروں پر پھبتیاں کسنے والے ہمیشہ ایک ایسا شکنجہ اپنے ساتھ لئے پھرتے ہیں جس میں وہ کسی پبلشر کو جکڑ سکیں اگر ہم بہاول پور کو گھر داماد صحافیوں کا شہر کہیں تو کچھ غلط بھی نہ ہوگا مگر جہاں تک فضل حمید کی ذات کا تعلق ہے وہ اس زمرے میں نہیں آتا کیونکہ اس نے ہفت روزہ ستلج کو روزنامہ بنا کر اپنی صحافیانہ صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے وہ جتنا منہ پھٹ ہے اتنا ہی کھلے دل کا مالک ہے کسی کے باعزت ہونے کی ایک بڑی دلیل یہ بھی ہے کہ وہ اپنے ملنے والوں کا احترام کرتا ہے اپنے کسی ملاقاتی کو کسی قیدی کا ملاقاتی نہیں سمجھتا۔

صحافی گری اس کا مسلک نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی اس کا مشن ہے سو اس اعتبار سے وہ خادم صحافت مگر ٹھہرو! کسی کی حیثیت کا تعین کرنے کا کسی کو کوئی اختیار نہیں فضل حمید وقت کے کٹہرے میں کھڑا ہے اور مستقبل کی عدالت ہی اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کر سکے گی ہم تو صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ فضل حمید یاروں کے یار ہیں وہ بدزبان ضرور ہے مگر بدلگام نہیں اور جب سے خط نستعلیق کاتبوں کے ہاتھ سے نکل کر مشینوں کے ہاتھو میں آیا ہے اس نے خود کو اپنی بیوی کے سپرد کر کے ایک نستعلیق شوہر بننے کی کامیاب کوشش کی ہے خدا اسے ثابت قدم رکھے۔ آمین!

نظریاتی

خاکہ

راشد عزیز ہاشمی

ناصر حسنی

رنگ ایسا گورا کہ نظر پھسل پھسل جائے اور گوریاں نوں پرے کرو۔ کی گردان بھول جائیں۔ آنکھیں کنجی ہیں جو کبھی کبھی ماسٹر کنجی کا کام کرتی ہیں۔ اگر محترم عطاء الحق قاسمی کے نظریے کو تسلیم کرلیا جائے تو فکری اعتبار سے راشد ہاشمی کو بھی نظریاتی کہا جاسکتا ہے کیونکہ قاسمی کے نظریے کے مطابق سابق وزیر اعظم میاں نواز شریف ایک نظریاتی شخصیت ہیں۔ ہم شخص اور شخصیت کے بارے میں کچھ کہنا بے ادبی سمجھتے ہیں کیونکہ شخص اور شخصیت کے معاملے میں قاسمی جیسے صاحب علم اور باخبر شخص کو بے خبر سمجھنا بہ ذات خود بے خبری کی انتہا ہے۔

راشد ہاشمی کو ہم اس لیے نظریاتی کہہ سکتے ہیں کہ وہ بھی ایک نظریہ رکھتا ہے۔ ان کے نظریے کے مطابق جیب خالی ہوتی ہے تو ہوتی رہے مگر پیٹ خالی نہیں ہونا چاہتے۔ پیٹ خالی ہو تب بھی ڈکاریں مارنا بہت ضروری ہے یوں بھی ڈاکہ مارنے سے بہتر ہے کہ آدمی ڈکاریں مارتا رہے۔ جسم گول مٹول ہے مگر ہاشمی کبھی ٹال مٹول سے کام نہیں لیتا جو کام اس کے دائرہ اختیار میں ہو وہ اس دائرے سے باہر نہیں نکلتا مگر جو کام اس کے دائرہ اختیار سے باہر ہو وہ اسے سرانجام دینے کی حامی کبھی نہیں بھرتا۔ اس کے والد محترم مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سے متاثر تھے یہ بھارت کے وزیر اعظم نریندر مودی کے متاثرین سے متاثر ہیں۔

شنید ہے یہ کبھی کسی کا صفایا نہیں کرتے حالانکہ صحافی صفایا کرنے کی مہارت میں ید طولیٰ رکھتے ہیں جہاں تک اس کے رکھ رکھاؤ کا تعلق ہے تو ہاشمی اس تعلق کو سر سے استوار رکھتا ہے اکثر لاہور اور اسلام آباد کے چکر لگاتا رہتا ہے۔ یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ چکر اس کے پاؤں کا چکر ہے یا صحافتی دائرے کا چکر ہے۔ اچھی بات یہ ہے کہ وہ کسی کو چکر نہیں دیتا۔ خود ہی چکر میں

رہتا ہے۔

راشد ہاشمی کو قارورہ ملانے کا شوق تو نہیں مگر اتفاقاً اس کا قارورہ بشیر احمد لنگاہ سے مل گیا ہے یوں ہاشمی نے اسے گلے لگا لیا ہے اب یہ دونوں صحافی اکثر و بیشتر اکٹھے دکھائی دیتے ہیں۔اگر کسی ادارے کے سربراہ کو انگور کے کھٹے ہونے کا یقین ہو جائے تو خبر سے متعلق صحافی کو منانے کیلئے اس کے دوسرے ساتھی سے رابطہ کرنا پڑتا ہے۔

ہاشمی کو گلے پڑنے کی عادت ہے اور نہ لنگاہ کو ایسا کوئی شوق ہے یوں خوش اسلوبی سے معاملہ طے ہو جاتا ہے۔

فطری طور پر یہ جماعیتہ ہے مگر ذہنی اعتبار سے صوفی ہے روزہ تو توڑ سکتا ہے مگر دل نہیں توڑتا کہتا ہے روزہ تو جڑ سکتا ہے مگر ٹوٹے ہوئے دل کو جوڑنے والی ایلفی ابھی تک ایجاد نہیں ہوئی ہے۔

خاندانی نام راشد عزیز ہاشمی ہے۔قلمی نام راشد ہاشمی ہے۔ناک نقشہ خاصا نمکین ہے شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی پیدائش سمندر کے کنارے آباد شہر کراچی میں ہوئی، والد محترم عبدالعزیز ہاشمی جماعت کے سرگرم و متحرک اور انتہائی فعال کارکن تھے انہوں نے خود کو جماعت اسلامی کیلئے وقف کر دیا تھا کاروباری سلسلے میں کراچی سے رخت سفر باندھا اور بہاولپور آن بسے۔

راشد ہاشمی نے میٹرک عباسیہ سکول بہاول پور سے کیا اور ایس ای کالج بہاول پور سے ایف۔اے کیا۔ابھی میس بھی نہیں بھیگی تھی کہ والد کی موت کا صدمہ سہنا پڑا اور گالوں پر آنسوؤں نے ڈیرہ جما لیا۔والد محترم کی بے وقت موت نے وقت سے پہلے بالغ کر دیا اور پھر یہ بلوغت بلیغ بن گئی مگر ہاتھ کی تنگی نے سیاسی طور پر بلیغ نہ بننے دیا۔ہاتھ تنگ ہو تو دماغ کشادگی سے محروم ہو جاتا ہے یہ سارا کھیل سارا تماشا ہاتھ کی لمبائی سے مشروط ہوتا ہے۔ہاتھ جتنا لمبا ہو دماغ اتنا ہی بڑا ہوتا ہے۔

لگ بھگ پندرہ سال سے صحافت کو جولان گاہ بنایا ہوا ہے مگر ابھی تک اپنا گھر نہیں

بنایا۔ شاید اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ موصوف نے صحافت کو مشن بنایا چرا گاہ نہیں بنایا۔ مختلف اخبارات سے وابستہ رہا ہے۔ آج کل آن لائن انٹرنیشنل نیوز ایجنسی میں اپنے جوہر دکھا رہا ہے۔ مختلف اخبارات میں فیچر اور آرٹیکل لکھ رہا ہے۔ اس کا خاص موضوع چولستان کے مسائل اور چولستانیوں کی دشواریاں ہیں۔ 2014ء میں بہاول پور جرنلسٹس فورم نے چولستان کے مسائل ادا کرنے پر بہترین رپورٹر کے اعزاز سے سرفراز کیا تھا۔ تحقیقاتی صحافت پر یقین رکھتا ہے۔ کبھی کبھی ''حقیقی'' صحافت سے بھی سمجھوتہ کر لیتا ہے کہ زندگی کی گاڑی پٹرول سے نہیں سمجھوتے سے چلتی رہے۔

مہمان نواز

خاکہ

محسن رضا جوئیہ

ناصر حسنی

من حیث القوم لفظوں کی بے حرمتی جس بے دردی سے ہم کرتے ہیں۔شاید ہی دنیا کی کوئی قوم کرتی ہو۔ ہم آب زم زم کا بہت احترام کرتے ہیں مگر حیران کن بات یہ ہے۔ سینٹری اسٹور کا نام زم زم رکھنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے۔ ابا جی! کے مرنے پر جائیداد کا بٹوارا کرتے ہیں اور بڑے دھڑلے سے ابا جی کے اسٹور کے سامنے جنرل اسٹور کھول کر نیو ابا جی سپر اسٹور چلانے لگتے ہیں اور مزے کی بات یہ ہے کہ اماں جی کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔اسی طرح کسی مرحوم کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کی وفات نے ایک ایسا خلا پیدا کیا ہے جو کبھی پر نہیں ہوگا یا مدتوں پورا نہیں ہوگا۔ حالانکہ ہم سبھی جانتے ہیں کہ جب کوئی خلا پر نہیں ہوتا تو بلیک ہول بن جاتا ہے۔

ممتاز بزمی بڑے ادب دوست اور ادیب نواز شخصیت کے مالک تھے آج تک یہ فیصلہ نہ ہوسکا کہ وہ وکیل اچھے تھے یا آدمی۔ ایک بار ہماری ویگن کا چالان ہوگیا منور جمیل قریشی نے ممتاز بزمی سے کہا کہ چالان کینسل کرادو۔ بزمی صاحب! نے کہا کہ یہ کوئی ذی وقار بات نہیں کہ سو، پچاس روپے معاف کرانے کیلئے کسی جج سے گزارش کی جائے۔ بزمی صاحب! کی بات سن کر بڑی خوشی ہوئی اور اس کے بعد ہم نے کبھی پیسے کی خاطر عزت نفس داؤ پر نہیں لگائی۔ محسن رضا جوئیہ سے ملاقات ہوئی تو اندازہ ہوا کہ ممتاز بزمی بلیک ہول بننے سے بچ گئے ان کا خلا جوئیہ صاحب نے پورا کر دیا ہے۔ جوئیہ صاحب! وکیل ہیں، سینئر نائب صدر و سیکرٹری ہائی کورٹ بار بہاول پور رہے ہیں۔ پیدائش 1960ء کی ہے مگر ابھی تک سٹپٹائے نہیں۔ حصول رزق کی خاطر وکالت کرتے ہیں مگر شکل صورت اور قد و قامت سے کھلاڑی دکھائی دیتے ہیں۔ گورنمنٹ کالج بہاول نگر کی فٹ بال

ٹیم کے کپتان رہے ہیں۔ حیرت ہے تحریک انصاف کے چیئرمین عمران خان کی نظروں سے اب تک پوشیدہ کیوں ہیں؟ شاید ایمپائر کی طرف سے ابھی تک انگلی نہیں اٹھی تھی۔ ریس لگاتے ہیں۔ ٹینس اور کرکٹ کھیلتے ہیں۔ والد محترم شاعر نے ممتاز حسین نام تھا اور اطہر تخلص تھا۔ گھر کا ماحول ادبی تھا۔ گورنمنٹ کالج بہاولنگر کے میگزین کے ایڈیٹر رہے ہیں۔ مزاحیہ مضامین اور خاکے لکھے ہیں۔ شاعری کی طرف دھیان ہی نہیں گیا کیونکہ جوئیہ صاحب! کا کہنا ہے کہ موت برحق ہے ہر انسان نے اس کا ذائقہ چکھنا ہے مگر آدمی کوشش کرے تو موت سے بھی مک مکا ہوسکتا ہے آدمی مر جاتا ہے مگر نام زندہ رہتا ہے۔ والد محترم شاعر تھے موت آئی مر گئے مگر ساتھ ہی نام بھی مر گیا۔ ممتاز حسین کو کوئی نہیں جانتا۔ بہت سے پڑھے لکھے اور ادیب سے دلچسپی رکھنے والے اطہر کو جانتے ہیں۔ والد محترم کا نام بھی مر گیا صرف تخلیق زندہ ہے شاید اسی لیے شاعری کی جانب توجہ ہی نہیں دی۔ اتنے مضامین اور خاکے لکھے ہیں جنہیں کتابی صورت دی جاسکتی ہے۔ سیر وسیاحت کا بہت شوق ہے اور اس شوق کی تسکین کی خاطر ملک کے مختلف شہروں اور بیرون ملک کی سیاحت کی ہے۔ فرصت ملی تو اپنے تجربات اور مشاہدات کو احاطہ تحریر میں لانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ پردادا کو موسیقی کا شوق تھا فن کے پرستار تھے۔ میر عالم نامی گلوکار کو ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ خاندان کے سبھی بچے اسے ڈاڈا کہہ کر بلاتے تھے۔ محسن رضا جوئیہ ابا جی تو بن گئے دادا بننے کی منتظر ہیں۔ جوئیہ صاحب کو شاعری سے اس حد تک لگاؤ ہے کہ دوسروں کے شعروں پر سر دھنتے ہیں۔ مکرر! مکرر! ارشاد! ارشاد! اور واہ! واہ! کی ردھم بہت پسند ہے، سو ذوق کی تسکین کی خاطر اپنی رہائش گاہ پر گاہے بگاہے شعری نشستوں کا اہتمام کرتے رہتے ہیں۔ دوسروں کو بولتا دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ خود بولنے کا مزا بہت کم لیتے ہیں غیر ضروری مقدمات کی طرح غیر ضروری قانونی موشگافیوں سے دور رہتے ہیں۔ غیر ضروری اور جعلسازی پر مبنی مقدمات سے الرجک ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ عدالتوں میں بہت کم دکھائی دیتے ہیں اس ضمن میں سوال کیا گیا تو کہا غیر ضروری اور جعلی مقدمات عدالتوں کا وقت اور قوم کا سرمایہ ضائع کرنے کا باعث بنتے ہیں مگر نظام عدل اصلاح کی اجازت

ہی نہیں دیتا۔

یہ کیسی بدنصیبی ہے کہ انگریز سے آزادی حاصل کر کے بھی آزاد نہیں ہوئے۔ ان کا قانون ہمیں غلامی کا احساس دلاتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ انگریز نے ہمیں آزادی نہیں دی ایک آزاد لفظ دیا ہے۔ سوری! انگریزوں کی جانب سے دیا ہوا لفظ ہماری بہت سی مشکلات کو فوری حل کر دیتا ہے۔

جوئیہ صاحب! کا انداز گفتگو بڑا دل پذیر ہے۔ محو گفتگو ہوں تو وکیل کو بے دخل کر دیتے ہیں سو، دوران گفتگو کسی کو انڈر پریشر نہیں کرتے اور نہ ادیبوں اور شاعروں پر غیر ملکی نام کے حوالے سے اپنی علمیت کا رعب جھاڑتے ہیں۔ بڑی فلسفیانہ اور دل میں اترنے والی گفتگو کرتے ہیں حالانکہ کسی وکیل یا کھلاڑی سے تحمل اور بردباری کی توقع ایک فعل لاحاصل ہے۔

مہمان نواز ہیں۔ مہمانوں کو اللہ کی رحمت سمجھتے ہیں۔ مہمان کو شہد کا شربت بادام کی گری والا شربت پلاتے ہیں۔ بشرطیکہ مہمان شوگر کا مریض ہو۔

امیتابھ کا چھوٹو

خاکہ

عالیہ خان

ارے واہ یہ تو بالکل امیتابھ کا چھوٹو ہے، ایک بچے نے چلاتے ہوئے انکشاف کیا۔

کتنی بار کہا ہے کہ بات کرنے سے پہلے سوچ لیا کرو۔ امیتابھ فلم اسٹار ہے ٹوتھ پیسٹ نہیں جس کا چھوٹو مارکیٹ میں لایا جائے دوسرے بچے نے فہمائش کی۔

کیا مصیبت ہے کیوں چلا رہے ہو؟ یہ عالیہ خان ہے روزنامہ ستلج کی کالم نگار ہم نے تصویر کو غور سے دیکھا اس کا ہیر اسٹائل کچھ کچھ امیتابھ سے ملتا جلتا تھا اس لیے بچے اس کو امیتابھ کا چھوٹوں کہہ رہے تھے۔ سچ کہا ہے پروین شاکر نے بچے ہمارے عہد کے چالاک ہو گئے۔

عالیہ خان سے میرا پہلا تعارف اس وقت ہوا جب میں روزنامہ ستلج سے وابستہ ہوا جہاں ہر ہفتے باقاعدگی سے اس کا ناقوس خیال سننا پڑتا انہی دنوں ایک صاحب، ناقوس خیال سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے ناقوس خیال سے اپنا سر کھجانا شروع کر دیا اور فساد خلق کی سعی نامشکور کی جدوجہد میں فشار خون میں مبتلا ہو گئے دروغ برگردن راوی اور اب دوسرا تعارف بہاول پور کی صحافت کے شہزادگان کی توسط سے ہو رہا ہے۔ محمد شہزاد اور قدرت اللہ شہزاد نے بڑی تگ و دو کے بعد جرنلزم سٹڈی سرکل کے نام سے ایک تنظیم بنائی ہے جو یہاں کے نوجوان صحافیوں پر مشتمل ہے اب یہ ایک الگ بات ہے کہ ان میں سے اکثر صحافی صحافتی خدمات کے ساتھ ساتھ ساٹھا پاٹھا کی افادیت اور اہمیت بھی اجاگر کرتے رہتے ہیں۔

ارے یہ بھڑوں کا چھتہ کہاں آ گیا درمیان میں، ہم تو عالیہ خان پر خاکہ لکھنے بیٹھے تھے مگر لکھنے سے قبل یہ فیصلہ کون کرے کہ عالیہ خاں واقعی کالم لکھتی ہے یا کالم نما مضامین۔ ایک بار کسی واقف کار نے کہا تھا کہ عالیہ خاں خود نہیں لکھتی۔

بہت اچھا کرتی ہے خدا توفیق دے تو ہم بھی ایک عدد منشی پالیں گے کہ خود لکھنے والوں کو

بڑھاپے میں رعشہ کا مرض لاحق ہوجاتا ہے، ہمارے جواب نے ان صاحب کو منہ بسورنے پر مجبور کردیا تھا۔ عالیہ خاں نے بال سنوارنے کا انداز شاید امیتابھ سے مستعار لیا ہو مگر اس کے لکھنے کا اسلوب اپنا ہے یہی وجہ ہے کہ اس کے کالم دوآتشہ ہوتے ہیں۔ مضامین پڑھنے کے شائقین ان کالموں کو مضمون سمجھ کر پڑھتے ہیں اور کالم کے شوقین ان مضامین کو کالم جان کر سر دھنتے ہیں، کئی اعتبار سے عالیہ خاں خاصی منفرد واقع ہوئی ہے۔ وہ فن کالم نگاری سے زیادہ قارئین سے مخلص دکھائی دیتی ہے۔ وہ ہمیشہ قاری کی انگلی پکڑ کر چلتی ہے کیا مجال کہ قاری ادھر سے ادھر بھٹک جائے۔ وہ جو کچھ کہتی ہے قاری اس سے زیادہ سوچنے کا متحمل ہی نہیں ہوتا۔ اس کے ہاں سادگی ہی سادگی ہے۔ پرکاری ڈھونڈنے والے اکثر انصار برنی ٹرسٹ میں جانکلتے ہیں۔ بہاول پور میں ایسے صحافیوں کی بھرمار ہے جن کی پڑھائی کا خانہ خالی ہے، مگر عالیہ خان خاصی پڑھی لکھی لگتی ہے اب یہ الگ قصہ ہے کہ بہاول پور میں صحافی بننے کیلئے محض درخواست نگار ہونا ضروری ہے دیگر اوصاف اضافی تصور کیے جاتے ہیں عالیہ خان کے کالموں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کو مرد بھی پڑھ سکتے ہیں کہ یہ نامحرم نہیں ہوتے۔ ہمارا مطلب یہ ہے کہ ان سے نسوانیت نہیں جھلکتی اگرچہ شہزادی عالیہ خاں کے کالم اس کی اپنی ذات سے تھوڑی بہت مشابہت رکھتے ہیں مگر اس کے باوجود ان میں نہ تو شہزادگی پائی جاتی ہے اور نہ ہی خانیت۔ وہ اتنے سیدھے سادھے اور بے ضرر ہوتے ہیں کہ ماہر غلطیات بھی ان کالموں میں کتابت کی غلطی نہیں کرسکتے۔ وہ صحافت میں ڈپلومہ ہولڈر ہے اور پیشے کے اعتبار سے وکیل ہے، اس سے بیشتر کہ وہ ہمیں طلبی کا نوٹس بھیجے، اس کی کالم نگاری کے معترف بلکہ مداح ہوجانے ہی میں عافیت سمجھتے ہیں مگر نہیں ابھی نہیں کہ یہ روایت شکنی ہوگی جبکہ ہم روایت شکن ہیں۔ ہمارے ہاں کسی کی فنی صلاحیت اس کے سماجی حیثیت سے مشروط ہوا کرتی ہے۔ ادبی مقام کا انحصار کرسی کی ساخت پر ہوتا ہے، منصب جتنا اونچا ہو، آدمی اتنا ہی قدآور ہوتا ہے تو عالیہ خان جب تم اس منصب پر پہنچوں گی جب تمہیں تم کہنے والوں کی زبان لڑکھڑانے لگے، بس تم سمجھ لینا کہ یہاں تم سا کوئی نہیں، کوئی نہیں۔ ہم یہ خاکہ لکھ ہی رہے تھے کہ

ہمارے ایک دوست نے کہا مفہوم عنقا ہے تیری تحریر کا۔ ہم خاکہ نگاری میں اتنے منہمک تھے کہ وضاحت طلب کر بیٹھے کہنے لگے تمہاری تحریریں لوگوں کے سر کے اوپر سے گزر جاتی ہیں۔

ہر اچھی بات لوگوں کے سر پر سے گزر جاتی ہے، آپ کوئی نئی بات کیجئے۔

نئی بات یہ ہے کہ اگر آپ اپنی تحریر کو بھول بھلیاں نہ بنائیں تو اہل شہر آپ پر نازاں ہوسکتے ہیں انہوں نے ہمیں ترغیب دی۔ ہمارے شہر کی ریت نرالی ہے۔ یہاں خود نازاں بننا پڑتا ہے اور جہاں تک ہماری ذات کا تعلق ہے تو ہم عمر کے اس حصے میں داخل ہو چکے ہیں جہاں پہنچ کر حضرت مومن نے کہا تھا:

عمر گزری عشق بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

ہم زاد

خاکہ

ناصر حسنی کا خاکہ

تحریر: ناصر حسنی

سعید احمد میرا ہم راز ہے۔ ہم سفر ہی نہیں ہم زاد بھی ہے۔ شکل وصورت، قد وقامت اور رنگ ونسل بھی ایک ہی ہے۔ پیشانی کشادہ ہے نہ تنگ ہے اور ایسی کوئی بات بھی نہیں جسے اس کی پیشانی کی انفرادیت کہا جاسکے۔ یوں سمجھ لو کہ لوح نصیب ہے، البتہ ہلکی سی مہراب ہے جو اسے دین دار ثابت کرتی ہے مگر میں جانتا ہوں کہ وہ دین دار تو کجا، دنیا دار بھی نہیں کسی ایم این اے نے پوچھا تھا۔ تم جماعت اسلامی کے بندے ہو تو اس نے جواباً کہا تھا کہ میں تو ابھی تک خدا کا بندہ بھی نہیں بن سکا حتیٰ کہ اپنی اہلیہ کا بندہ بھی نہ بن سکا شاید اسی لیے وہ اب تک تنہا ہے۔ آنکھیں نہ چھوٹی ہیں نہ موٹی ہیں، ناک پھیلی ہوئی ہے نہ ستواں ہے بس یہی غنیمت ہے کہ ناک والا ہے۔ فی زمانہ یہی سب سے بڑا اعزاز ہے کیوں کہ روز بروز ناک والے کم ہوتے جارہے ہیں۔ نسب حسب حال نہیں مگر نسب سے انکار ممکن نہیں۔ سید علی ترمذیؒ جداعلیٰ ہیں جن کا مزار بونیر سوات میں ہے۔ مشہور ہے صاحب کرامت ہیں جن کی شادی بھانجی ماروں کی وجہ سے عدالتی تاریخیں بن گئی ہو۔ وہ مزار شریف جاکر دعا مانگیں تو ان کی شادی ہوجاتی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان کے نسب کا کوئی دولہا پانی پی رہا ہو تو اس کا جھوٹا پینے سے جلد شادی ہوجاتی ہے۔ ہمارا جھوٹا ایک شخص نے پیا تھا۔ اس کی شادی بہت جلد ہوگئی مگر ہماری شادی بہت جلد ٹوٹ گئی۔

والد محترم مرتے دم تک ناراض رہے اس کا اصرار تھا کہ دنیا کا ڈرامہ لکھے ہوئے اسکرپٹ کے مطابق اسٹیج کیا گیا ہے۔ لوح محفوظ عالم رنگ و بو کے وجود سے قبل مرقوم کی گئی تھی اس لیے گناوثواب اور دوزخ وجنت کا کیا مطلب ہے۔ والد محترم صرف ونحو کے ماہر تھے، مدرسہ عالیہ رامپور میں پڑھایا کرتے تھے پھر ریاست سچین میں مفتی اعظم قاضی القضات مقرر ہوئے۔

1948ء کی جنگ میں بھارت کے ایک کیپٹن کی ہلاکت پر انڈین حکومت اور اخبارات نے شہید لکھا تو مفتی اعظم نے فتویٰ دیا کہ کپٹن کو جاں نثار طن تو کہا جا سکتا ہے مگر اسے شہید کہنا اور لکھنا غلط ہے۔ سردار پٹیل نے ملاقات کی کہ بھارت ایک سیکولر ملک ہے آپ ایسے فتوے نہ دیا کریں پاکستان کے جوان بھی مذہب کیلئے نہیں اپنے ملک کیلئے لڑتے تھے اگر وہ شہید ہیں تو ہمارے جوان بھی شہید کہلانے کے حق دار ہیں۔ بھارت میں کسی مذہبی عہدے کی ضرورت نہیں۔ آپ بھارت کے کسی بھی شہر کے کالج میں پروفیسر کے عہدے پر فائز ہو سکتے ہیں اور آپ کی دس پندرہ سالہ سروس کو ملازمت میں ضم کیا جا سکتا ہے۔ مگر اس پیشکش کو مسترد کر کے پاکستان چلے آئے کلیم کیلئے رشوت طلب کی گئی تو ہی پھاڑ کر پھینک دیا۔ سعید کو والد محترم سے شکایت تھی کہ آپ نے ہمارا حسب ہی نہیں نسب بھی بگاڑ دیا ہے۔ پنجابی ہمیں پٹھان کہتے ہیں۔ پٹھان ہمیں پنجابی کہتے ہیں۔ ہجرت کے بعد آپ کو صوبہ سرحد اپنے علاقے میں جانا چاہیے تھا۔

سعید احمد میٹرک کے بعد ڈیزرٹ رینجرز میں بھرتی ہو گیا۔ محکمے کی طرف سے ڈسپنسر کی ٹرینگ وکٹوریہ ہسپتال بہاول پور سے کی کچھ عرصہ آرمی ہسپتال سے تربیت حاصل کی اور سپاہی سے حوالدار بن گیا ایک حادثے میں بایاں گھٹنا زخمی ہو گیا۔ آپریشن کے دوران تھائی مسل ڈیج ہو گیا اور ناٹ ایکٹو سروس کی بنیاد پر پنشن ہو گئی سعید احمد نے اس معاملے میں بہت احتجاج کیا اور یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ میڈیکل سروس، ایکٹو سروس کے زمرے میں نہیں آتی مگر نقار خانے میں طوطی تو کیا طوطی خان کی بات بھی کوئی نہیں سنتا۔

لوگ ڈاکٹر صاحب کہہ کر پکارتے تھے سو، بہاول پور ہومیو کالج بہاول پور سے چار سالہ کورس کیا۔ روزنامہ ستلج سے کالم نگاری کا آغاز کیا۔ روزنامہ دستور بہاول پور میں کچھ عرصہ نیوز ایڈیٹر بھی رہا۔ مغربی پاکستان جو بیک وقت لاہور بہاول پور اور سکھر سے شائع ہوتا تھا اس میں ادبی کالم لکھنے لگا اور پھر مغربی پاکستان بہاول پور کے ایڈیٹر بشیر انصاری (مرحوم) کے مشورے پر کراچی جا بسا وہاں مختلف ڈائجسٹوں میں کام کیا۔ جنگ، حریت اور جسارت میں کالم لکھے۔ ابتداء

میں مختلف رسائل میں کہانیاں لکھیں اور جب افسانچہ نگاری شروع کی تو خوب نام کمایا۔''مردہ شہر کا زندہ آدمی'' افسانچوں اور افسانوں کی کتاب شائع کی تو مقبولیت میں مزید اضافے کا سبب بنی۔ اس کتاب پر کم از کم بیس پچیس مضامین لکھے جا چکے ہیں۔ایم فل بھی ہو چکا ہے۔ادبی کالموں پر بھی ایم فل ہو رہا ہے۔آٹھ کتب اشاعت کی منتظر ہیں۔دیکھئے!ان کی باری کب آتی ہے۔کالموں اور خاکوں کی کی کتابیں طباعت کے مراحل سے گزر چکی ہیں۔

سعید احمد کو علمیت اور مطالعہ پر بہت زعم ہے۔خود کو عقل کل سمجھتا ہے۔ہر معاملے میں ٹانگ اڑانے کی علت میں بھی مبتلا ہے۔قادیانیوں کو اقلیت قرار دیا گیا تو کہنے لگا۔فساد کی تخم ریزی کر دی گئی ہے۔ایسے کئی فرقے ہیں جنہیں اقلیت قرار دینا چاہیے۔کیوں کہ ان کے اور ہمارے علماء ایک دوسرے کو کافر قرار دیتے ہیں۔جب تک ایسے علماء موجود ہیں مسلمان ایک قوم نہیں بن سکتے۔ایک فرقہ تو برملا کہتا ہے کہ جبرائیل کی غلطی سے محمدﷺ رسول بن گئے ورنہ۔

تم سے کتنی بار کہا ہے ایسے موضوعات پر مبنی کتب مت پڑھا کرو۔تمہاری سوجھ بوجھ ان مسائل کی متحمل نہیں ہوسکتی۔گمراہ ہو جاؤ گے۔والد محترم نے سمجھایا تو کہنے لگا میرے گمراہ ہونے کا امکان تو آپ کو دکھائی دے رہا ہے مگر جو گمراہ ہیں ان کی گمراہی دکھائی نہیں دیتی۔تمام مولوی چار چار بیویوں کو اسلام کی منشا قرار دیتے حالاں کہ قدرت نے واضح طور پر کہا کہ انصاف نہیں کر سکتے مگر شادی در شادی کی خواہش بے لگام گھوڑے کی طرح سرکشی پر ہمیشہ مائل رہتی ہے اور انصاف کا بھوت سر چڑھ کر کہتا ہے کہ ہاں، ہاں، ہم انصاف کر سکتے ہیں جہاں خدا کی نیابت کے بجائے شیطان کی جانشینی پر فخر کیا جاتا ہو وہاں عام آدمی کیسے انصاف کر سکتا ہے۔

سورۃ البقرا کے ترجمے کے دوران مولوی صاحب نے بتایا کہ دوزخی لوگوں کے دلوں پر اللہ نے مہر لگا دی ہے اور اُن کانوں پر دبنیر پردے ڈال دیئے ہیں۔جس شخص کے دل پر گناہ کی مہر لگا دی گئی اور کانوں پر پردے ڈال دیئے گئے ہوں اس کیلئے دوزخ اور جنت کہاں سے آ گئی۔یہ سنتے ہی مولوی صاحب نے ڈنڈوں کی بارش کر دی۔دس دن تک ہلدی کا لیپ لگتا رہا،طبیعت بہتر

ہوئی تو والد محترم نے سمجھایا کہ دلوں پر مہر اور کانوں پر دبیز پردے محاورتاً کہا گیا ہے، جیسے تم لوگ دل کالا ہو گیا ہے اس کا دل پتھر ہو گیا ہے اس کے دل پر قفل لگا ہے اور جو شخص سننے کا روادار نہ ہو۔ اس کیلئے کہتے ہو کہ اس نے کانوں میں تیل ڈال لیا ہے۔ قرآن فرقان نے ایسے لوگوں کے کانوں پر دبیز پردے کا استعمال کیا ہے۔

ادب دوست

خاکہ

ممتاز حسین بزمی

ممتاز حسین بزمی بہاول پور کی ممتاز شخصیت ہین، نام ہی کے نہیں کام میں بھی ممتاز ہیں۔متناسب قد وقامت ہے، جاذب نظر نقش و نگار ہیں، پیشانی کشادہ ہے جس کے سائے میں روشن آنکھیں بہت نمایاں ہیں، بڑے عالم فاضل آدمی ہیں حالانکہ ٹبہ عالم گیر اور بنگلہ فاضل کا سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ادب سے زیادہ ادیب پرور ہیں اور اگر ادیب یا شاعر کا تعلق صنف نازک سے ہوتو پھر ان کے ذہن رسا کی نزاکتیں اپنے عروج پر ہوتی ہیں۔جسم و جان کی تسکین کی خاطر وکالت کرتے ہیں اور روح و قلب کی تسکین کے لئے شاعری کرتے ہیں۔سیلف میڈ آدمی ہیں نظریاتی اعتبار سے ان کا تعلق پیپلز پارٹی سے ہے اور اس تعلق کی پاداش میں ضیائی دور میں میاں والی جیل کی تنگ، تاریک کوٹھری میں تین سال گزارے ہیں۔جذباتی طور پر سبھی سے متاثر ہوتے ہیں اور سبھی کو متاثر کرتے ہیں لیکن آج تک کسی ایسے بندے کے بارے میں نہیں سنا گیا جس کا تعلق ان کے ''متاثرین'' میں ہوتا ہو کلائینٹ کی بات اور ہے۔ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے سیاسی نظریے پر کئی کتابیں تالیف کر چکے ہیں مگر ابھی تک ''تالیف قلب'' کا اہتمام نہ ہو سکا۔بزمی صاحب خوبصورت آدمی ہیں خوبصورت باتیں کرتے ہیں، محفل خواہ کیسی بھی ہو ہمیشہ خوش کلامی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ہر حال میں مست رہتے ہیں مگر ''دمادم مست قلندر'' سے دور رہتے ہیں خوبصورت لب و لہجے کے مالک ہیں۔ ہمہ وقت مسکراتے رہتے ہیں بعض احباب کا خیال ہے کہ ان کی مسکراہٹ ملکہ ترنم نور جہاں کی مسکراہٹ کی طرح پلاسٹک سرجری کا کمال ہے۔دھیمے سروں میں بولتے ہیں ان کے منہ سے نکلنے والے لفظ شہد کے قطروں کی طرح ٹپکتے محسوس ہوتے ہیں مگر اکثر دانش وروں کا خیال ہے کہ ان کے منتخب لفظ غیر منتخب سرکاری مشیروں کی طرح عام آدمی کے لئے مشکل کا سبب بنتے ہیں۔خوبصورتی کے پرستار ہیں۔خوبصورت لوگوں میں اٹھتے بیٹھتے ہیں

محتاط طبع ہیں اس لئے اٹھک بیٹھک کے دوران پٹھوں پر کم سے کم بوجھ ڈالتے ہیں۔ مشاہدے سے زیادہ مطالعے کے قائل ہیں کتاب کا تعلق کسی بھی قبیلے سے ہو، سرسری طور پر دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ چسکے لے لے کر ورق ورق کھنگالتے ہیں اور پھر ایک عمدہ سا تبصرہ صادر فرماتے ہیں۔ دیکھئے! محترم رضا عابدی کی کتاب ''شیر دریا'' پر کیا خوبصورت تبصرہ کیا ہے۔

''ہمارے ہاں لکھے جانے والے سفرنامے عورت کے بغیر نامکمل رہتے ہیں مگر ''شیر دریا'' کو پڑھ کر یوں لگتا ہے جیسے رضا عابدی خواتین کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔''

ممتاز بزمی کو دیکھ کر کسی معصوم بچے کا سراپا آنکھوں کے سامنے لہرانے لگتا ہے۔ پھولے پھولے رخسار، روشن آنکھیں، لبوں پر مچلتا شوخ تبسم، پہلی ملاقات میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ان کا جسم زیادہ گداز ہے یا دل؟؟؟ نام کے معاملے میں بہت کم لوگ اپنے والدین کا بھرم رکھتے ہیں مگر ممتاز حسین بزمی واقعی ممتاز ہیں، اپنے پیشے میں بھی ممتاز ہیں اور دوستوں میں بھی ممتاز ہیں جس محفل میں موجود ہوتے ہیں وہ محفل ''محفل بزمی'' بن جاتی ہے اور جہاں تک ان کے حسین ہونے کا تعلق ہے تو یہ تعلق کربلا سے مشروط ہے۔ ویسے یزیدیت سے نبرد آزما ہونا ان کا مشغلہ ہے۔ ضمیر کی آواز اور پیشے کا تقاضا شیر و شکر ہو تو آدمی ممتاز بھی ہوتا ہے، حسین کا پیروکار بھی بن جاتا ہے اور بزمی بھی کہلاتا ہے۔

یاری سے زیادہ یار باشی کے قائل ہیں یاری کا کیا ہے؟ یہ تو کسی بھی وقت تڑک کر کے ٹوٹ سکتی ہے۔ یوں بھی یار کے نخرے اٹھانے سے بہتر ہے کہ آدمی ہر ''جی'' کو ''جی آیاں توں'' کہتا رہے۔ سنا ہے ایک دانش مند بہت سے دانش ور بنا سکتا ہے مگر بہت سے دانش ور مل کر بھی ایک دانش مند نہیں بنا سکتے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ دانش وری پیشہ بن گئی ہے اور دانش مندی ''مندی'' کا شکار ہو چکی ہے۔ ادب دوستی نے انہیں ادیب پروری کے ہنر سے نوازا ہے۔ سخن شناسی اور شعر فہمی کے جوہر نے انہیں پارس بنا دیا ہے جس کی رسائی ان تک ہوئی سونا بن گیا بلکہ سونے کی کان بن گیا اور کمال یہ ہے کہ اس سونے سے بنا ہوا جھمکا کسی بھی بازار میں گم نہیں ہوتا۔

ممتاز حسین بزمی دوستی کے آداب سے آگاہ ہیں اور دشمنی نبھانے کا ہنر بھی خوب جانتے ہیں جب وہ کسی دشمن سے لڑنے کے لئے سولہ ''ہتھیاروں'' سے لیس ہو کر نکلتے ہیں تو ان کی کیفیت اس ''بُل'' جیسی ہوتی ہے جو بُل بائٹر کو لال رومال ہلانے کی پاداش میں پاش پاش کر دینا چاہتا ہے چونکہ اسپین اور روہی کی آب و ہوا خاصی مختلف ہے اس لئے بہاول پور کا بُل کلر بلائنڈ ہوتا ہے۔ شاید اسپین والے یہ بات نہیں جانتے۔

ہمارے ہاں ایسے بہت سے افراد پائے جاتے ہیں جو افسروں میں شاعر اور شاعروں میں افسر ہوتے ہیں مگر ممتاز حسین بزمی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ ادیبوں میں ادیب، شاعروں میں شاعر اور وکیلوں میں وکیل ہی رہتے ہیں۔ بعض لوگوں کی نظر میں بزمی صاحب ایک متعصب شخص ہیں اردو بولنے والوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے مگر یہ سراسر بہتان ہے البتہ اس الزام میں اتنی حقیقت ضرور ہے کہ بزمی صاحب کا شعری ذوق بہت بلند ہے۔ وہ افکار سے عاری سطحی جذبات کی مظہر شاعری سے الرجک ہیں ایسی شاعری سن کر ان کا بلڈ پریشر ہائی ہو جاتا ہے جو لوگ اردو کو اپنے گھر کی لونڈی سمجھتے ہیں بزمی صاحب انہیں لونڈا سمجھتے ہیں۔ ایک مشاعرے میں ظہور آثم کو پہلی بار سن کر کہا اگر یہ غزل اس نے کہی ہے تو بہت اچھی ہے۔ ظہور آثم اسٹیج سے واپس آیا تو کسی نے بزمی صاحب کے تبصرے سے آگاہ کیا۔ وہ ''پھرکی'' کی طرح گھوما اور بزمی صاحب سے کہا۔ ''بزمی صاحب, میں محنت کش ہوں، سچا اور کھرا محنت کش خیرات سے نفرت کرتا ہوں۔ میں تو اصلاح کو بھی خیرات سمجھتا ہوں۔

بہت سال پہلے ان کی شخصیت کے حوالے سے ایک شام منائی گئی تھی مضمون نگاروں کا کہنا تھا کہ بزمی صاحب! خوش کلام ہیں، خوش جمال ہیں، چشم غزل ہیں اس کے باوجود ایک مشکل آدمی ہین تو ان کی بیٹی پروفیسر صائمہ بزمی نے جواباً! کہا تھا کہ جو شخص دشمنوں کے ساتھ بھی اخلاص برتے اور خلوص کا دامن نہ چھوڑے وہ مشکل آدمی نہیں ہوسکتا اور مجھے یہ کہنے میں کوئی امر مانع نہیں ہوسکتا کہ میرے ابو ہرگز مشکل آدمی نہیں دراصل ان کی شخصیت اتنی ہمہ جہت ہے کہ اس کا تجزیہ کرنے والے مشکل میں پڑ جاتے ہیں واقعی! بیٹی خدا کی رحمت ہوتی ہے، والدین کا وقار ہوتی ہے بزمی

صاحب کی تین بیٹیاں ہیں اور تینوں ہی ان کے لئے باعث افتخار ہیں، ایک بیٹا بھی تھا جو کم عمری میں ہی اللہ کو پیارا ہو گیا۔

بزمی صاحب اچھے باپ ہی نہیں اچھے شوہر بھی ہیں۔ بیٹے کی طرح فرماں بردار، چھوٹے بھائی کی طرح ناز بردار اور قادرالکلام ہیں اور ان کی یہ قادرالکلامی وکالت کرتے وقت جوبن پر ہوتی ہے۔ شائستگی کا یہ عالم ہے کہ انہیں عدالت میں دیکھ کر کورنش کا مطلب لغت دیکھے بغیر سمجھ میں آ جاتا ہے۔ فوج کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے مگر فوج داری مقدمات میں ان کی رائے جج صاحبان کو بہت متاثر کرتی ہے۔ سنا ہے ان کی فیس بھرنا زہر کا گھونٹ بھرنے کے مترادف ہے اگر ہمارے پاس زہر کھانے کے لئے پیسے ہوتے تو ہم بھی زہر کا یہ گھونٹ ضرور بھرتے۔ ممکن ہے کہ کسی نے بے پر کی اڑائی ہو اور یہ کام یقیناً کسی دوست کا ہو سکتا ہے کیونکہ وہ دشمن پالنے کے بکھیڑے میں کبھی نہیں پڑتے۔ آدمی شائستہ ہیں اس لئے شال میں لپٹنے کے ماہر ہیں۔ مگر یہ کام تو ہر وہ وکیل کرتا ہے جو اپنے کلائنٹ کی اپیل دائر کرتا ہے۔ البتہ کسی نامور شاعر کے روبرو یہ فریضہ سرانجام دینا علمیت کی دلیل ہے۔ ایک نامور شاعر کی موجودگی میں ان کے ایک شعر کو سرقہ قرار دے دیا اور ثبوت کے طور پر ایک قدیم شاعر کا شعر بھی پیش کر دیا مگر اس انکشاف سے اس بزرگ اور نامور شاعر کی شاعرانہ حیثیت پر کوئی حرف نہیں آتا کہ ایسے اتفاقات تو غالب جیسے شاعر کے ہاں بھی پائے جاتے ہیں۔ ہم عصر شعراء کے کلام میں بھی موجود ہیں۔ احمد فراز نے کہا تھا۔

زیست ایک آدھ محبت سے بسر ہو کیسے
رات لمبی ہو تو پھر ایک کہانی کم ہے

احمد صغیر صدیقی کہتے ہیں

عمر کب گزرتی ہے اس طرح کی حالت میں
مبتلا ہو جائے دوسری محبت میں

اور بہاول پور کا نوجوان شاعر اظہر فراغ کہتا ہے۔

کوئی بھی شکل مرے دل میں اتر سکتی ہے
ایک رفاقت میں کہاں عمر گزر سکتی ہے

ہلالِ بھاولپور

خاکہ

سابق جسٹس فرخ محمود

ناصر حسنی

فرخ محمود اسمِ بامسمیٰ ہیں، مزاجاً فرخ ہیں، اخلاقاً محمود ہیں، خوش کلامی اور خوش اخلاقی وکالت کی طرح ورثے میں ملی ہے، فطرتاً خوش خصال اور خوش کردار ہیں، دل موہ لینے والی عادات کے سبھی دلدادہ ہیں مگر کلائنٹ کیلئے دادا بننا پسند نہیں کرتے مخالف وکلاء بھی انکی خوش اخلاقی اور خوش دلی کے گن گاتے ہیں، جرح کے دوران کم بولتے ہیں، جب بولتے ہیں تو مخالف وکلاء کی ساری قانونی موشگافیاں چائے کی پیالی کا طوفان دھواں بن کر تحلیل ہو جاتا ہے، پیشانی کشادہ ہے، چہرہ ایسا پرکشش ہے کہ دیکھنے والوں کی آنکھوں کی چمک بڑھا دیتا ہے قد اتنا لمبا نہیں کہ عالم چنا کی یاد آنے لگے، اتنا چھوٹا بھی نہیں کہ بوٹا سا کہا جائے، دراز قامد نہیں خوش قامد ہیں، رنگ گندمی ہے مگر گندم سے کوئی دشمنی نہیں، بھوک کا حساس ہو تبھی کھاتے ہیں، اوروں کو کھلا کر خوشی محسوس کرتے ہیں، مفتی فیملی سے کوئی تعلق نہیں، پیشے کے اعتبار سے مفتی ہیں، ضرورت مندوں کو مفت مشورہ دیتے ہیں، مقدمہ مفت نہیں لڑتے، پیروی کے دوران لڑنا جھگڑنا خون میں شامل ہی نہیں۔

چہل قدمی کے عادی ہیں، سو، بیماریاں ان کے آگے چلتی ہیں، پیچھے پڑنے سے گریزاں رہتی ہیں، نزلہ زکام کھانسی موسم کا تحفہ ہے، تحفے سے کون انکار کرسکتا ہے، دنیاداری اور دینداری کا خوبصورت امتزاج ہیں، تلاوت باقاعدگی سے کرتے ہیں صوم وصلوٰۃ کے بھی پابند ہیں غریب پروری سرشت میں شامل ہے، علم دوسری ورثے میں ملی ہے، مَنٹو کا ناغہ کرتے ہیں نہ نماز قضا کرتے ہیں، اچھی شاعری اور اچھا افسانہ پڑھ کر جھوم اٹھتے ہیں، ظہور آثم کی بینائی سلامت تھی تو لاہور ہائی کورٹ میں ملازمت کیا کرتا تھا فراغت ہوتی تو اس کی غزلیں بڑے اہتمام سے سنا کرتے تھے، ان کے ادبی ذوق سے متاثر ہو کر ظہور آثم نے ہمارے چند افسانچے مطالعے کے لئے دئے بہت متاثر ہوئے اور مَنٹو نامہ گفٹ کر دیا جو ہمارے لئے رامائن بن گیا، روہی کے باسی ہیں، مگر ''پرتو'' روہیلا سے کوئی نسبت نہیں، اختیارات سے تجاوز کرنے والوں سے وہی سلوک کرتے ہیں جو بلدیہ کے افسران ناجائز تجاوزات کرنے والوں سے کرتے ہیں، شنید ہے، ہائی وے پولیس اس سانحہ سے گزر چکی

ہے جو دوسروں کیلئے باعث عبرت بن گیا تھا، معمولاتِ زندگی میں سب سے اہم معاملہ دل کا ہوتا ہے مگر مسئلہ یہ ہے کہ عمارت عالی شان ہو تو داخلہ ممنوع علاقہ بن جاتا ہے اور کسی ممنوع علاقہ میں داخل ہونا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔

سابق چیف جسٹس فرخ محمود نیک نام وکیل تھے اپنی نیک نامی اور پیشہ ورانہ صلاحیتوں کے سبب جج کے عہدے پر فائز ہوئے اور پھر عدالت عظمیٰ میں جسٹس کی مسند پر متمکن ہوئے، کچھ عرصہ قبل بہاول پور کی انتظامیہ کی جانب سے ہلال بہاول پور کے اعزاز سے سرفراز ہوئے، اکثر وکلاء پہلے فیس لیتے ہیں پھر مقدمہ لیتے ہیں، محترم فرخ محمود پہلے مقدمہ دیکھا کرتے تھے پھر فیس لیا کرتے تھے ہم اس خوبی کے چشم دید گواہ تو نہیں مگر اس پر یقین ضرور رکھتے ہیں کیونکہ ہم نے یہ وصف اپنے کلاس فیلو عبدالمجید بھٹی میں دیکھا تھا، پہلے مقدمات کی تفصیلات دیکھتے اور پھر فیس لیتے تھے، بھٹی مرحوم کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ ہم جماعتوں سے فیس نہیں لیتے تھے، کہتے تھے دید ولحاظ سے بڑی کوئی فیس نہیں۔

فرخ محمود آبائی وکیل ہیں وبائی نہیں، اب یہ ایک الگ بات ہے کہ ہمارے ہاں آبائی وکیل کم اور وبائی وکیل زیادہ ہیں، شاید یہی وجہ ہے کہ مقدمات بھی کورونا کی طرح وبائی صورت اختیار کر لیتے ہیں، صحبت کا اثر تو پڑتا ہی ہے اس تناظر میں لازم ہے کہ جعلی ڈگریاں رکھنے والے سیاست دانوں کی طرح جعلی سند یافتہ وکلاء کو بھی سزا یافتہ بنایا جائے مگر مشکل یہ ہے کہ بیج اتنا کمزور ہے کہ وہ بار کونسل کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی، سو یہ سوچنا بھی ضروری ہے کہ ایسی بینچ کا کیا فائدہ جو بار اٹھانے کے بھی قابل نہیں، المیہ یہ بھی ہے کہ ہمارے ہاں قابلیت کی کوئی اہمیت ہی نہیں، اہم بات یہ سمجھی جاتی ہے کہ آدمی کتنا با اثر با اختیار اور مالی طور پر کتنا مستحکم ہے، ملکی ادارے جائیں بھاڑ میں اس معاملے میں دماغ سوزی کو مغز ماری کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔

خوش قامد اور خوش شکل ہونا خداداد خوبی ہے، شخصیت سازی میں اہم کردار ادا کرتی ہے، مگر کردار سازی کیلئے خوش اخلاق اور خوش گفتار ہونا بہت اہم ہوتا ہے، سابق جسٹس فرخ محمود خوش قامد ہیں خوش شکل ہیں خوش کردار ہیں اور خوش رفتار بھی ہیں، عوام ہی میں نہیں خواص میں بھی خوش نظر ہیں، صبح سویرے تلاوت کلام پاک اور فجر کی نماز کے بعد واک ان کا معمول ہے، اپنے معمولات سے فراغت کے بعد پیشہ ورانہ ذمہ داری کیلئے عدالت کا رخ کرتے ہیں، عام مشاہدہ اور مطالعہ یہی

ہے کہ خوش قامد اور خوش شکل افراد اپنی ملکیت خداداد کے ساتھ وہی سلوک کرتے ہیں جو خواص مملکت خداداد کے ساتھ کرتے ہیں، مگر فرخ محمود ملکیت خداداد کے ساتھ وہ سلوک نہیں کرتے جو خواص مملکت خداداد پاکستان کے ساتھ روا رکھتے ہیں۔

فرخ محمود کے والد محترم محمد دین بہاول پور کے ہی نہیں پورے پاکستان کے ممتاز اور نامور وکیل تھے، ان کی قابلیت اور لیاقت کا اعتراف کلائنٹ ہی نہیں جج بھی کرتے ہیں، قانون سے متعلق انکی لکھی ہوئی کتب کے باعث بہت سے نو آموز وکلاء نامور وکلاء بن چکے ہیں، مرزا غالب کو اپنے آبائی پیشہ سپاہ گری پر فخر تھا فرخ محمود کو بھی اپنے آباء کے پیشے پر ناز ہے ان کے برادر نسبتی سابق جسٹس سعید اعجاز چندا بھی ایک نامور وکیل ہیں فرخ محمود کے فرزند ارجمند خرم محمود ہائی کورٹ کے جج ہیں۔

گزشتہ دنوں ہماری ملاقات محترم فرخ محمود سے ہوئی انہوں نے ہماری کتاب ''مردہ شہر کا زندہ آدمی'' کی بہت تعریف کی، ہمارے اندازِ بیاں اور اسلوب کو سراہا۔ بادشاہ، بادشاہ ہوتا ہے جب جی چاہا کسی کا سر قلم کر دیا۔ جب جی چاہا سرفراز کر دیا۔

خلعت فاخرہ عطا کرنا یا پیراہن چاک کرنا ان کی مرضی اور موڈ پر منحصر ہوتا ہے۔ ہر شاہ مزاج ہندی میں 'مودی'' اور انگریزی میں موڈی ہوتا ہے، یہی وتیرا ناقد کا بھی ہوتا ہے۔ جس کو چاہے لفظوں سے نواز دے جسے چاہے بے نقط سنا دے اور کسی نقطے کو اوپر نیچے کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔ ہم حیران ہیں کہ ناقدین اپنی ساری زہانت اور فطانت کے باوجود یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ اللہ کو دایاں ہاتھ بہت پسند ہے۔

ادب کے ناقدین کہتے ہیں کہ خاکہ اسکیچ کی طرح ہوتا ہے۔ اسکیچ کی طرح لکیروں کا کھیل ہے۔ مگر وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ اسکیچ اداروں کو مطلوب افراد کا بنایا جاتا ہے اور خاکہ دلوں کو مطلوب لوگوں کا لکھا جاتا ہے۔ ناقدین کسی بھی خاکہ نگار پر خاک اڑانے کا الزام لگا کر اپنی علمیت کی دھاک بٹھانے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ خاک ہوگی تو اڑائی جائے گی۔ خاک ہی نہ ہو تو خاکہ خاک لکھا جائے گا۔

سیاست کا ولی

خاکہ

ولی خان

ناصر حسنی

خان ولی خان کے سیاسی نظریات سے بہت سوں کو اختلاف ہے لیکن ان کی سیاسی اخلاقیات اور سیاسی اصولوں سے ان کے بدترین دشمن بھی اتفاق کرتے ہیں اگر سیاسی رہنماؤں کا یہ اتفاق، اتفاق فونڈری سے اتفاق کرنے جیسا نہ ہوتا تو وطن عزیز کو جس سیاسی بحران اور سیاسی قیادت کے فقدان کا سامنا ہے کبھی نہ ہوتا۔ خان ولی خان سیاست دان ہی نہیں سیاسی منکر بھی ہیں۔ دہشت گردی کے خلاف اعلان جنگ کرنے والے اگر ان کے افکار سے استفادہ کرتے تو بندوق اٹھانے کی نوبت ہی نہ آتی۔

خان ولی خان کا سیاسی کردار نصف صدی سے زیادہ عرصے پر محیط ہے اس کے باوجود ایوان اقتدار سے دور ہے۔ کسی مارشل لاء یا کسی غیر آئینی حکومت کا حصہ نہ بنے۔ 1970ء کے انتخابات میں ان کی جماعت صوبہ سرحد کی سب سے بڑی جماعت کے طور پر ابھری تو انہوں نے اپنے خاندان کے کسی فرد کے بجائے اپنی جماعت کے رہنما ارباب سکندر کو گورنر بنوا دیا۔ ایک بار جنرل ضیاءالحق نے ان کی بات سے ناراض ہو کر کہا تھا کہ ولی خان تم ملک و قوم کی خدمت کی باتیں تو بہت کرتے ہو مگر عملاً گریزاں رہتے ہو۔ جواب میں ولی خان نے کہا تھا کہ میں چور دروازے سے ایوان اقتدار میں نہیں آؤں گا۔ قوم نے اعتماد کا دوست دیا تو انکار نہیں کروں گا۔

خان ولی خان بشری خرابیوں اور خوبیوں سے مزین تھے جب غصے میں ہوتے تو کہا کرتے تھے اگر ہمیں جائز اور آئینی حقوق نہ دیے گئے تو ہم پیٹ پھاڑ کر اپنے حقوق چھین لیں گے تو ان سے خوف آنے لگتا تھا مگر جب حیدرآباد جیل میں کمرے کی سفیدی کرنے والے نے پوچھا کہ ان کی چکی کو کون سا رنگ کیا جائے تو انہوں نے کہا تھا۔ رنگ کے بارے میں ذوالفقار علی بھٹو

سے پوچھو۔ میں تو مہمان ہوں آج نہیں تو کل چلاؤں گا مگر وہ آیا تو پھر نہ جا سکے گا۔ چند ہ دِنوں بعد مارشل لاء لگ گیا اور ذوالفقار علی بھٹو کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا گویا یہ بات سچ ثابت ہوئی کہ پٹھان کا پوت کسی بھی وقت ولی بن سکتا ہے۔

خان ولی خان اسم با مسمیٰ تھے پلمبروں میں پیمبر تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں جس سیاسی فلسفے کی تبلیغ کی اگر اس پر عمل کیا جائے تو ملک میں کبھی سیاسی بحران آئے نہ سیاسی قیادت کا فقدان پیدا ہو۔ سیاست دان اقتدار کی ہوس سے پاک ہو کر ملک وقوم کی خدمت کا عزم لے کر سیاست میں آئیں تو کبھی ملک وقوم سے بے وفائی کے مرتکب نہ ہوں۔ سیاست اس وقت تجارت بن جاتی ہے جب ذاتی مفادات کو قومی مفادات پر ترجیح دی جاتی ہے۔

خان ولی خان نے تمام عمر بے داغ سیاست کی۔ ہمارے ہاں کوئی سیاست دان ایسا نہیں جس کے دامن پر ہوس اقتدار کی چھینٹیں نہ ہوں۔ وہ شعلہ بیان مقرر تھے ان کے سیاسی افکار سے متفق نہ ہونے والے بھی ان کی تقاریر بڑے شوق سے سنا کرتے تھے۔

ایک بار جنوبی پنجاب میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا ہم پٹھان بہت سادہ لوح ہوتے ہیں۔ گفتگو کے دوران عورت کو مرد اور مرد کو عورت بنا دیتے ہیں مگر پنجاب کے لوگ اس معاملے میں ہم سے بہت آگے ہیں یہ تو زنخوں کو مرد بنا دیتے ہیں۔

ان کی اہلیہ نسیم ولی خان بھی مجمع کو سحر زدہ کرنے کے ہنر سے آگاہ تھیں جن دنوں خان ولی خان حیدر آباد جیل میں تھے وہ رائے عامہ کو ہموار کرنے کیلئے ملک کے مختلف حصوں میں تقاریر کر رہی تھیں ایک بار تقریر کے دوران ان کی چادر سر سے سرک گئی انہوں نے بغیر کسی گھبراہٹ کے اس موقع سے اتنا بھرپور استفادہ کیا کہ وہاں پر موجود بزرگ سیاست دان حیران رہ گئے۔ بیگم نسیم ولی نے ایک نظر پنڈال میں بیٹھے لوگوں پر ڈالی اور کہا۔ مجھے ننگے سر دیکھ کر میری شرم وحیا کا ماتم مت کرو۔ اپنے گریبانوں میں جھانکو۔ تم جیسے بھائیوں کی موجودگی میں ایک ظالم وجابر شخص نے میرے سر سے چادر اتار لی ہے۔ ان کا اتنا کہنا تھا کہ پنڈال ہوائی فائرنگ سے گونج اٹھا وہاں پر

موجود لوگوں کا جوش وخروش قابل دید تھا وہ کہہ رہے تھے کہ ہم تمہارے ایک اشارے پر اپنی بندوق کا رخ اسلام آباد کی طرف موڑ سکتے ہیں عوام کا جوش وخروش دیکھ کر پنڈال میں پر ہول سناٹا چھا گیا۔ بزرگ سیاست دان خوف زدہ ہو گئے کہ کہیں نسیم ولی خان کوئی جذباتی فیصلہ نہ کر بیٹھیں مگر انہوں نے ایک ایسا فیصلہ کیا جوان کے خاندان کی حب الوطنی کی دلیل بن گیا۔انہوں نے کہا کہ یہ ایک سیاسی معاملہ ہے اور سیاسی معاملات مکالمے یا بیلٹ کے ذریعے طے کئے جاتے ہیں۔'' بلٹ'' سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ہم انقلاب کی نہیں سیاسی تبدیلی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ہمیں آپ کی بندوقوں کی نہیں ووٹوں کی ضرورت ہے۔

خان ولی خان 1990ء کے عام انتخابات میں مولانا حسن جان سے مقابلے میں ہار گئے تھے اس وقت کے وزیراعظم میاں نواز شریف نے انہیں دوسرے حلقے سے انتخاب لڑنے کی پیشکش کی لیکن انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ اپنے حلقے سے انتخاب ہارنے والے کو کسی دوسرے حلقے سے انتخاب لڑنے کا حق نہیں ویسے بھی یہ بات سیاسی اخلاقیات کے خلاف ہے اور مجھ سے سیاست دان کو زیب نہیں دیتی یہ ایک ایسی بات ہے جو اعتزاز احسن جیسے سیاست کار کبھی نہیں سمجھ سکتے۔

مولانا مودودی نے کتنی سچی بات کہی ہے کہ جس کا کوئی دشمن نہیں ہوتا وہ کسی کا دوست نہیں ہوتا۔خان ولی خان ایک دشمن دار شخص تھے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا ادراک سبھی کو تھا لیکن یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ ان کے دوستوں کی تعداد کتنی ہے۔ان کے نماز جنازہ میں شریک لوگوں کی تعداد اس بات کی گواہ ہے کہ خان ولی خان کے دوستوں اور چاہنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

پیپلز پارٹی شملہ معاہدہ کو بھٹو مرحوم کی بہت بڑی سیاسی کامیابی قرار دیتی ہے مگر واقفان حال جانتے ہیں کہ اس کامیابی میں خان ولی خان کی حب الوطنی شامل تھی۔

جنرل نیازی کے قبیلے سے تعلق رکھنے والے ایک ادیب نے اپنی کتاب میں شملہ معا

ہدے کا تذکرہ کرتے ہوئے فخریہ انداز میں لکھا کہ بھٹومرحوم جو کام مذاکرات کی میز پر نہ کر سکے وہ کام بستر پر کرلیا تھا مگر باخبر حلقے جانتے ہیں کہ جب شملہ مذاکرات ناکام ہونے لگے تھے تو خان ولی خان کے تعلقات نے شملہ معاہدہ میں اہم رول ادا کیا تھا شملہ سے واپس آ کر بھٹومرحوم نے اندرا گاندھی کی ہدایت کے مطابق خان ولی خان کا شکریہ ادا کیا تھا اوران اصلاحات کا تذکرہ کیا تھا جوان کی حکومت اگلے چند برسوں میں نافذ کرنے کا تہیہ کر چکی تھی تو خان صاحب نے کہا تھا کہ مسٹر بھٹو! کسی خوش گمانی میں رہنے کی ضرورت نہیں جولوگ آپ کو اقتدار میں لاتے ہیں وہ آپ کو تادیر برداشت نہیں کریں گے بلکہ آپ کو معزول کر کے تخت سے اٹھا کر تختہ دار پر چڑھا دیں گے ملک توڑنے کیلئے آپ نے جو کھیل کھیلا ہے اس کی سزا بہت ضروری ہے اور پھر چشم فلک نے دیکھا کہ خان ولی خان کی پیش گوئی لفظ بہ لفظ درست ثابت ہوئی بعض ناقدین خان ولی خان کو ایک ناکام سیاست دان سمجھتے ہیں حالانکہ وہ وطن عزیز کے سب سے کامیاب سیاست دان تھے ان کی سیاست کا مقصد بھارت دوستی اور صوبوں کو زیادہ سے زیادہ خودمختاری دلانا تھا۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اب بھارت سے محاذ آرائی کا بھوت سیاست دانوں کے سر سے اتر چکا ہے اور صوبوں کو زیادہ سے زیادہ خودمختاری کی اہمیت کو تسلیم کرلیا ہے۔ خان ولی خان افغانستان میں روس کی شکست کو عالم اسلام کی شکست قرار دیا کرتے تھے اور وقت نے ثابت کر دیا ہے کہ واقعی روس کی شکست عالم اسلام کی شکست تھی۔

سبز رُتوں کا پیامبر

خاکہ

جنرل ضیاء الحق

ناصر حسنی

پُرعزم، با کردار، مذہب کے شیدائی مگر نہ مذہبی سہی مالیخولیا سے محفوظ، کشادہ پیشانی پر خوشحال زندگی اور درخشاں زندگی کے واضح اور گہری لکیریں۔ چاق و چوبند جسم جو ہمہ وقت مصر وف عمل رکھتا ہے۔ فراخ دل ایسے کے مخالفین کی بارودی سوچ کو بھی اپنی بے ساختہ مسکراہٹ کی بو چھاڑ سے شبنمی بنا دیتے ہیں۔ سرسری طور پر ان کے سراپے پر نظر ڈالی جائے تو ''بھولے بادشاہ'' دکھائی دیتے ہیں مگر جب تفصیلی جائزہ لیا جائے تو ''بھولے'' ٹی وی کا بھولا پہلوان بن جاتا ہے اور ان کے وجود میں صرف ''بادشاہ'' رہ جاتا ہے۔

بڑی شخصیتوں کا ایک بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کا بھی بہت زیادہ برا مناتی ہیں اور جب اپنی خفگی کا اظہار کرتی ہیں تو مشاہدہ کی بھٹی ٹھنڈی اور تجربہ کی آنچ سرد پڑ جاتی ہے نتیجتاً ایسے لوگ ''عمل کشید'' کی بجائے ''انڈیلنے'' کا مظاہرہ کرتے ہیں اور یوں وقت کا بہاؤ ان کی شخصیت کو بھی بہالے جاتا ہے مگر ہمارے بادشاہ سلامت کے معاصرین کا بڑا المیہ یہی ہے کہ موصوف چھوٹی موٹی باتیں تو درکنار بڑی بڑی باتوں پر بھی چھوٹی موٹی رنجش کا بھی اظہار نہیں کرتے یہی وجہ ہے کہ ان کی حکومت خطرناک قسم کے مظاہروں سے محفوظ رہی۔

حرف ''چ'' سے ان کو بہت عقیدت ہے کہ چ سے چار دیواری، چ سے چار یار، چ سے چار صوبے اور چلہ کشی وغیرہ لکھے جاتے ہیں چھتری ان کے مزاج کے خلاف ہے مگر اس کی افادیت یہ ہے کہ یہ چھڑی کا نعم البدل ہے۔ یوں بھی موسم خواہ کتنا ہی خشک ہو بارش کے امکان کو مسترد تو نہیں کیا جاسکتا۔

خاندانی نام محمد ضیاء الحق ہے۔ مگر مذہب سے شدید لگاؤ کی بناء پر بے تکلف دوستوں

اور حاسدوں میں ''مولوی'' کے نام سے پہچانے جاتے ہیں انتہائی محنتی انسان ہیں قسمت سے زیادہ اپنے زور بازو پر یقین رکھتے ہیں۔ مقدر کے سکندر ہیں تقدیر نے جنرل بنایا مگر یہ اپنی جدوجہد سے ''صدر مملکت'' کے عہدہ پر بھی فائز ہیں، آدھے فوجی اور آدھے سویلین ہیں گویا شہید اور غازی کے جملہ حقوق محفوظ رکھتے ہیں۔

وفاداری بشرط استواری ان کا مسلک ہے۔ اگر فرش بیت اللہ کو اپنے اشکوں سے دھونا باعث نجات گردانتے ہیں تو دوسری طرف مسند کی گھنٹیاں ہلانے کو بھی کامیابی کی کلید سمجھتے ہیں۔

ان کے کارہائے نمایاں کی تفصیل جرنیلی سڑک سے بھی زیادہ طویل ہے غیر کاروباری ہونے کے باوجود گلشن کا کاروبار چلا رہے ہیں اور خوب چلا رہے ہیں غیر سیاستدان ہونے کے باوجود جدی پشتی سیاست دانوں کو چاروں خانے چت کر چکے ہیں اور اب ہر خانے پر ان کے کسی پیادے کا قبضہ ہے۔

فوجی مہارت کے اظہار کا تو ان کو موقع نہ ملا مگر قدرت نے سیاسی سوجھ بوجھ سے جی بھر کر نوازا ہے۔ اگر یہ تاجر ہوتے تو کاروبار فی سبیل اللہ کرتے اور اپنے شوکیس میں سجی ہوئی ہر چیز قسمت خرید پر ہی فروخت کر دیا کرتے کہ ان کو اپنی نیک نامی بہت عزیز ہے۔

پسندیدہ مشروب زیرِ چنار چشمے کا پانی ہے مگر دنیاداری نبھانے کی خاطر ''کوکا کولا'' سے بھی شغل فرماتے ہیں۔ اگر چہ دانتی بکف لوگ ان کو اچھے لگتے ہیں مگر ان کی میزان عدل کا پلڑا ترازو پکڑنے والوں کی سمت ہی جھکا رہتا ہے۔

مبارک عدد نو ہے اور ہر وہ پتھر سعد ہے جس کا جگر پھول کی پتی کا پتا پانی پانی کر سکے۔

کون جانے! شہرت کی دیوی کو ان کی جرنیلی پسند ہے یا صدات کہ وہ اس طرح ان کی آغوش میں آدُبکی ہے جس طرح جنگ زدہ علاقہ میں فوجی خندق میں دبک کر بیٹھتے ہیں۔

آثار بتاتے ہیں کہ کسی دور میں ان کی طبع پر مزاح کا رنگ غالب رہا ہوگا مگر وسیع مطالعہ، عمیق مشاہدہ اور کہن سالی کے سبب ان کے مزاج پر انشا تیاتی رنگ چھا گیا ہے اب وہ سنجیدہ

کام کرتے وقت بھی غیر سنجیدہ ہو جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ بعض محکموں میں ایسے افراد بھی پائے جاتے ہیں جو اپنے شعبہ کی الف۔ب سے بھی آ گاہ نہیں۔

جنرل صاحب کے ادیب ہونے کی نفی جتنی آسان ہے ان کے ادیب گر ہونے سے انکار کرنا اتنا ہی مشکل ہے اس معاملہ میں ان کی ہمسری کا دعویٰ آرٹ کونسل بہاول پور ہی کر سکتی ہے۔

مدتوں ہمیں یہ خیال اپنے حصار میں جکڑے رہا کہ فوجی سیاست نہیں جانتے، مقام شکر ہے کہ ہمارے جیالوں نے اس وہم کا طلسم توڑ دیا اور اب ہماری فوج سیاستدان بنانے والے ایک بڑی فیکٹری بن چکی اور اب یہ خیال بھی مسترد کیا جا چکا ہے کہ ہماری فوج کی حساب دانی تین پانچ اور نو دو گیارہ تک محدود ہے اپنے نصیب کی طرح ہر شخص کے وقت کا معیار مختلف ہوتا ہے۔ ممکن ہے پڑوسی کا ایک دن ہمارے کئی دنوں کے برابر ہو شک کرنے والے اور یہ بات نہ سمجھیں تو محترم علی تنہا سے رابطہ کر سکتے ہیں۔

کسی سیانے نے بوتل کے بارے میں کہا تھا کہ یہ کافر کے منہ کو لگ جائے تو چھوٹتی نہیں مگر عام مشاہدہ یہ ہے کہ بوتل مسلمان ہو یعنی دودھ کی ہو تب بھی مشکل ہی سے چھوٹتی ہے۔ جنرل صاحب بادشاہ بنے تو انہوں نے سوچا کہ اب کوئی کام بھی بادشاہوں والا کیا جائے سو انہوں نے، زنجیر جہانگیری، کی طرز پر زنجیر ضیائی تشکیل دی جس کو ہلانے والے کے ہاتھوں سے لہو رسنے لگتا ہے مگر ''عدل جہانگیری'' دستیاب نہیں ہوتا کہ بادشاہ اور جرنیل میں آخر کچھ تو فرق ہونا ہی چاہیے۔

ہم من حیث القوم سب کچھ ہو سکتے ہیں مگر منکر نہیں کہ ہمارے ہاں انکار کی حدیں کفر سے ملحق ہیں کہ ہم پہلے ''ہاں میں ہاں'' ملانا اپنی ہتک گردانتے ہیں۔ جنرل صاحب کی ایماء پر ہم آہنگ ہو کر کورس کی صورت ''ہاں'' کا راگ الاپنے لگے اور یوں پوری قوم ہی ''ہاں والی'' بن کر رہ گئی حتیٰ کہ ہمارے فصحائے لفظ ''نا'' کو ''مردود'' قرار دے ڈالا۔ اب ان کے نزدیک ناجائز اور

ناشائستہ جیسے لفظ غیر جائز اور غیر شائستہ ہیں۔

عوام کی خواہشات اور سیاستدانوں کی نفسیات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ الیکشن کو سلیکشن میں بدلنے کے ردعمل کو ایک فطری عمل جانتے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ فطرت جتنی دبائی جائے اتنی ہی ابھرتی ہے اس لئے الیکشن کو ریفرنڈم کی صورت عطا کی اور عوام یہ جان کر حیرت زدہ رہ گئی کہ چھوٹے میاں ہر دور میں سبحان اللہ ہی ہوتے ہیں۔

جن سیاست دانوں نے اس ریفرنڈم کا حقہ پانی بند کرنے کی کوشش کی تھی اب وہ آپس ہی میں ایک دوسرے کا حقہ پانی بند کرنے کی کوشش میں کامیاب ہونا چاہتے ہیں اور کھلے بندوں یہ اعتراف کررہے ہیں کہ لیفٹ رائٹ کرنے سے دماغ کی چولیں اپنی جگہ ہرگز نہیں چھوڑتیں بلکہ ایسا کرنے والا نہ لیفٹ ہوتا ہے اور نہ ہی رائٹ بلکہ وہ غیر جانبدار ہوتا ہے۔

تن آسانی ان کا شیوہ ہے اور نہ مشکل پسندی ان کا مسلک ہے یہی وجہ ہے کہ عہد حاضر کی شریں اب کوہ کنی کی طلبگار نہیں یوں بھی دودھ کی طلب کار طفلاں ہے اب تو کوئی بھی شخص مسند پرویز پر فائز ہوسکتا ہے بس شرط یہ ہے کہ وہ ''ولی'' نہ ہو اور ''عشرت گہہ خسرو'' کا دریچہ ہر اس شخص کیلئے کھل سکتا ہے جسے ''غوث'' ہونے کا دعویٰ ہو، طبعاً انتہائی شریف ہیں۔ اس لئے جب کسی شخص کو نوازتے ہیں تو اس نوازش میں اپنی شرافت ضرور شامل کر لیتے ہیں۔ سنا ہے انہیں بلّے کی ''میاؤں، میاؤں'' اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ ریاست کی چادر پر جو داغ پڑے ہیں ان کا لیبارٹری ٹیسٹ تو فی الحال ایک وقت طلب مرحلہ ہے مگر حکومت کی چار دیواری میں رخنہ انداز ہونے کی کوشش میں بڑے بڑے ماہر تیر انداز اپنی کمان توڑ بیٹھے یا ''پل مسلز'' کے عارضہ میں مبتلا ہو گئے۔

''آوے'' کے بگاڑ کا اعتراف تو جنرل صاحب نے بھی کیا ہے، مگر ''باوے'' کا نزالہ ہونا ابھی تصدیق طلب ہے کہ ان کی انتہائی کوشش یہی ہے کہ جب بھی کوئی مصور علامہ اقبال کے ''مردِ مومن'' کو پینٹ کرانا چاہے تو اس کے برش سے جنرل صاحب ہی کی شبیہ اترے اب یہ ایک

الگ بات ہے کہ مردمومن کی ''زنبیل''، ''نانی اماں'' کی پٹاری بن چکی ہے۔ ملک دشمن عناصر کی سرپرستی یا پرستاری کو جمہوریت کی علامت سمجھتے ہیں کہ جس طرح کلمہ گوئی ردکفر ہے اسی طرح پاکستان شہریت بھی حب الوطنی کی دلیل ہے۔

ہیبت کے اعتبار سے ہم ان کے دورحکومت کو تجرباتی دور کہہ سکتے ہیں کہ اس دور میں ''چولے'' بدلنے کے تجربات خاصے بڑے پیمانے پر ہوتے رہے۔

فطرتاً عدل پسند ہیں ان کے دربار میں ادیب اور خطیب ہم مشرب وہم پیالہ ہیں، تاریخی حقائق سے انکار کوطفلانہ حرکت گردانتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ جو اندھیرا چراغ تلے پہلے تھا اب بھی ہے۔ رینجرز کے جوان فوج کا ہراول دستہ ہونے کے باوجود جس طرح لانگ بوٹوں سے روندے جاتے ہیں اس کی مثال ممکن ہی نہیں بس اتنا ہی کہا جاسکتا ہے کہ جس کی دونوں آنکھیں سلامت ہوں وہ بھلا سب کو ایک آنکھ سے کیونکر دیکھ سکتا ہے۔

آدمی خوش بختی اور بدبختی کا مجموعہ ہوتا ہے چونکہ جنرل صاحب بھی اول وآخر آدمی ہیں اس لئے یہ ''بختیاں'' بھی ان کی زندگی کا لازمی جز ہیں۔ مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ انہوں نے جس کا بھی قبلہ درست فرمایا آخر اس کا کعبہ کیوں ٹیڑھا ہوگیا اور ان کی ہر پیش رفت ''پچھل پائی'' کا نقش پا کیوں بن گئی؟

ناصر حسنی کے قلم میں کاٹ ہے یہ چھوٹے چھوٹے جملوں سے بڑے بڑوں کو رقص بسمل پر مجبور کر دیتا ہے۔ صدر ضیاء الحق کے عہد میں ان کو سبز رتوں کا پیامبر قرار دیتے ہوئے کیا چوٹ کی ہے۔ مقدر کے سکندر ہیں تقدیر نے جنرل بنایا مگر اپنی جدوجہد سے 'صدر مملکت' کے عہدے پر فائز ہیں۔ اگر فرش بیت اللہ کو اپنے اشکوں سے دھونا باعث نجات گردانتے ہیں۔ تو مندر کی گھنٹیاں ہلانے کو بھی کامیابی کی کلید سمجھتے ہیں۔

پروفیسر سید طالب حسین شاہ

ناصر حسنی اپنی جملہ تحریروں کے آئینہ میں وہ ظالم و بے باک لکھاری ہے جس کی باریک دور بین نظر اپنے ممدوح کی ان صفات کو بھی سامنے لانے کا ہنر جانتی ہے جن سے بسا اوقات خود بھی پوری طرح آشنا نہیں ہوتا۔ اس کے تحریر کردہ خاکوں کی دیگر خصوصیات میں سراپا نگاری، ایجاز و اختیار، ایمائیت، پہلوداری، ذو معنویت، بے باکی، زہر ہلال کو قند نہ کہنا اور زبان خلق کو نقارہ خدا سمجھنا اہم ہیں۔ وہ ایک ایسا ذہین، ضدی مناظرہ باز ہے جو اپنے ممدوح کے شخصی اوصاف، اخلاقی خصائل زندگی کے واقعات اور معاشرہ میں اس کے بارے میں پائی جانے والی آراء اور افواہوں تک کو اپنے طے کردہ فریم میں اس طرح فکس کرتا چلا جاتا ہے کہ ممدوح کے 'فکس' ہونے میں کوئی کسر باقی نہیں رہ جاتی۔

پروفیسر ڈاکٹر ذیشان اطہر

ناصر حسنی لفظوں کا کھلاڑی ہے، قلمی تصویریں بناتا رہتا ہے۔ اس کے مشاہدات اور تجربات کی بقچی میں بہت سے خاکے ہیں اور قومی اخبارات میں شائع شدہ کالموں کے ان گنت ورق ہیں۔ اس کے افسانچوں کا بھی ایک دفتر ہے۔ اس کی بقچی کریدیں تو افسانچوں کی ایک کتاب 'مردہ شہر کا زندہ آدمی' بھی مل جائے گی اس کی یہ کتاب منصۂ شہود پر آ کر اہل علم سے داد وصول کر چکی ہے

حسنی کتاب گھر مہاجر کالونی بغدادلجدید گلی نمبر 08 بہاولپور

Designed & Printed by: The University Printing Press, IUB Ph: +92 62 9255598